اِسلام
اور عصرِ جدید

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-۲۵

اسلام اور عصرِ جدید

مدیر

اقتدار محمد خاں

نائب مدیر

محمد سعید انور

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

اسلام اور عصرِ جدید
(سہ ماہی)

(جنوری، اپریل، جولائی، اکتوبر)

جلد نمبر:۵۴ جولائی ۲۰۲۲ء شمارہ:۳

ISSN 2278-2109

اعانت زر کی شرحیں

	فی شمارہ	سالانہ	
اندرون ملک	100/روپے	380/روپے	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
پاکستان و بنگلہ دیش	4/امریکی ڈالر	15/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ڈاک سے)
دیگر ممالک	12/امریکی ڈالر	40/امریکی ڈالر	(رجسٹرڈ ہوائی ڈاک سے)

حیاتی رکنیت

اندرون ملک	5000/روپے
پاکستان و بنگلہ دیش	150/امریکی ڈالر
دیگر ممالک	400/امریکی ڈالر

اس شمارے کی قیمت 100/روپے

پرنٹنگ اسسٹنٹ: راشد احمد **ٹائٹل:** ارتج گرافکس

© جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ

مقالہ نگاروں کی رائے سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

پتہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

Website: www.jmi.ac.in/zhiis E-mail:zhis@jmi.ac.in

طابع و ناشر: **پروفیسر اقتدار محمد خاں** اعزازی ڈائرکٹر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

مطبوعہ : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

بانی مدیر

ڈاکٹر سید عابد حسین (مرحوم)

مجلسِ ادارت

پروفیسر نجمہ اختر (صدر)

- پروفیسر طلعت احمد
- نجیب جنگ آئی۔اے۔ایس (ریٹائرڈ)
- سید شاہد مہدی آئی اے ایس (ریٹائرڈ)
- لیفٹیننٹ جنرل محمد احمد ذکی (ریٹائرڈ)
- پروفیسر اختر الواسع
- پروفیسر محمود الحق
- پروفیسر سلیمان صدیقی

فہرست

❑ حرفِ آغاز	اقتدار محمد خاں	۷
❑ بدلتے حالات میں علومِ اسلامیہ کی منصوبہ بندی	عبید اللہ فہد	۱۵
❑ مذہبی تصورات کا مبداء کیا ہے؟	سید محمد کاظم نقوی	۴۳

❑	ہندومت ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ لفظ ہندو کی تحقیق: تاریخ، مذہبی مصادر، تہوار اور فرقے	ظفر دارک قاسمی	۶۳
❑	دورِ حاضر میں مخلوط تعلیمی نظام اور اسلامی تعلیمات	محمد اسامہ	۱۱۹
❑	دین اور اس کی ضرورت	عتیق الرحمٰن قاسمی	۱۳۷

حرف آغاز

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ خدیجہؓ کے وصال کے بعد سیدہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے سنہ دس نبوی کو (ہجرت سے تین سال قبل) مکہ مکرمہ میں نکاح کیا۔ نکاح کے وقت آپؐ کی عمر پچاس سال تھی۔ سیدہ سودہؓ قریش کے قبیلے عامر بن لُوی سے تعلق رکھتی تھیں۔ والد کی طرف سے آپؓ کا نسب حسبِ ذیل ہے:

سودہ بنت زمعہ بن قیس بن عبد شمس جبکہ والدہ کی طرف سے اس طرح ہے: سودہ بنت شموس بنت قیس بن زید۔ آپؓ کی ولادت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے چالیس سال قبل ہوئی۔ آپؓ کا سلسلۂ نسب نبی کریمؐ کے نسب مبارک سے ''لُوی'' میں جا کر مل جاتا ہے۔ آپؐ کے نانا قیس بن زید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم کے برادرِ نسبتی تھے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ مدینہ کے مشہور قبیلہ بنونجار کے فرزند قیس بن زید کی ہمشیرہ سے آپؐ کے پردادا ہاشم کی شادی ہوئی تھی۔ سیدہ سودہؓ کا پہلا نکاح اپنے چچازاد بھائی حضرت سکران رضی

اللہ عنہ سے ہوا۔ حضرت سکران کا قدیم الاسلام صحابہؓ میں شمار ہوتا ہے۔ حضرت سکران سے سیدہ سودہؓ کو ایک بیٹا عبدالرحمٰن پیدا ہوا جو جنگ جلولاء میں شہید ہوگئے۔

حضرت سودہؓ کا شماران لوگوں میں ہوتا ہے جو اسلام کی دعوت کانوں میں پڑتے ہی مشرف بہ اسلام ہوگئے تھے۔ ان کے شوہر حضرت سکران بن عمرو نے بھی ان کے ساتھ ہی اسلام قبول کرلیا۔ ہجرت حبشہ کے وقت یہ دونوں حضرات مکہ مکرمہ میں ہی رہے۔ مشرکین مکہ کی جانب سے جب مظالم بڑھ گئے اور مسلمانوں کی بڑی تعداد نے ہجرت حبشہ کا ارادہ کرلیا تو یہ دونوں حضرات بھی ہجرت کر گئے۔ دونوں میاں بیوی کئی سال حبشہ میں قیام پذیر رہے، پھر واپس مکہ آ گئے۔ مکہ واپسی کے کچھ دنوں بعد حضرت سکرانؓ فوت ہوگئے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آ کر بیٹھتے تو حبشہ میں بیتے ہوئے دنوں کی روداد سناتیں اور آپؐ بڑی دلچسپی سے سنتے۔ خصوصاً حضرت رقیہؓ اور حضرت عثمانؓ کے ذکر میں آپ گہری دلچسپی لیتے جو ان دنوں حبشہ میں مہاجرین کی زندگی گزار رہے تھے۔

حبشہ سے مکہ واپسی کے بعد سیدہ سودہؓ نے ایک خواب دیکھا کہ آپؐ تشریف لائے اور سیدہ سودہؓ کی گردن پر اپنا قدم مبارک رکھا۔ خواب کا تذکرہ اپنے شوہر سے کیا تو انھوں نے تعبیر بتائی کہ میں جلد ہی فوت ہو جاؤں گا اور تم محمدؐ کی زوجیت میں جاؤ گی۔ ایک دوسرے خواب میں آپؓ نے دیکھا کہ چاند آپؓ کی آغوش میں آ گیا ہے۔ اس خواب کا تذکرہ بھی اپنے شوہر سے کیا تو انھوں نے پھر فرمایا کہ اس خواب میں بھی اشارہ ہے کہ میں جلد ہی فوت ہو جاؤں گا اور تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت کا شرف حاصل ہوگا۔ حبشہ سے

واپسی کے کچھ ہی عرصہ بعد حضرت سکران بیمار ہوئے اور اسی علالت میں فوت ہو گئے ۔(اناللہ وانا الیہ راجعون)

سیدسودہؓ اپنے شوہر کی وفات پر صدمے سے دوچار تھیں اور دوسری طرف آپؐ اپنی زوجہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات پر پریشان رہا کرتے تھے۔ چوں کہ کسی بھی مشکل ترین امر اور قیادت میں شریک حیات کی حاجت حد درجہ محسوس ہوتی ہے اور آپؐ سب سے بڑی عالم گیر دینی، سماجی، معاشرتی اور انسانی تحریک کی تن تنہا قیادت فرما رہے تھے اور کفار مکہ کی اذیتوں کو حوصلہ مندی اور صبر وتحمل سے برداشت کیے جا رہے تھے، ایسے حالات میں تسلیاں دینے اور دکھ بانٹنے والی اہلیہ کی وفات، گھر میں بچیوں کی تربیت اور دیکھ بھال اور سب سے بڑھ کر خدا کے دین کو ساری دنیا میں پھیلانے کی منظّم منصوبہ بندی اور پیش رفت، یہ سارے مسائل اس بات کے متقاضی تھے کہ آپ کی دینی یک سوئی اور اپنے مشن کی تکمیل کے لیے ایک رفیقۂ حیات ہو جو امور مذکورہ میں آپؐ کا ساتھ دے۔ ایسے حالات میں حضرت عثمان بن مظعون کی اہلیہ حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کو ایک غم گسار رفیقِ حیات کی ضرورت ہے۔ فرمایا: جی ہاں۔ اس پر خولہؓ نے فرمایا کیا میں آپ کے لیے نکاح کا پیغام کہیں دے دوں۔ فرمایا: مناسب ہے، خواتین اس کام کے لیے موزوں ہوتی ہیں۔ پھر آپؐ نے استفسار فرمایا کس جگہ پیغام دینے کا خیال ہے؟ خولہؓ نے فرمایا یا: رسول اللہ! اگر آپ کسی کنواری سے نکاح کرنا چاہیں تو آپ کے نزدیک تمام مخلوق میں محبوب ترین دوست حضرت ابوبکر کی صاحب زادی حضرت عائشہؓ موجود ہے، ان سے نکاح فرمالیں اور اگر کسی بیوہ سے نکاح فرمانا

چاہیں تو سودہ بنت زمعہؓ موجود ہے جو آپ پر ایمان بھی لا چکی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا دونوں جگہ پیغام دے دیں۔ نبی کریمؐ سے اجازت حاصل ہونے کے بعد خولہؓ سب سے پہلے حضرت سودہ بنت زمعہؓ کے پاس آتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر خیر و برکت کے دروازے کھول دیے ہیں۔ میں آپ کے پاس حضورؐ کا پیغامِ نکاح لائی ہوں۔ حضرت سودہؓ نے سن کر فرمایا: ''میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، وہ میرے ہادی بھی ہیں راہ نما بھی، میری ذات سے متعلق انھیں مکمل اختیار ہے، وہ جو چاہیں فیصلہ فرمائیں۔ حضرت سودہؓ کی رضا مندی کے بعد حضرت خولہؓ ان کے والد زمعہ کے پاس جاتی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام نکاح پیش کرتی ہیں۔ زمعہ نے یہ سن کر کہا: 'ھو کفو کریم' (وہ تو بہت اچھے کفو ہیں) سیدہ سودہؓ کا خواب اس طرح شرمندۂ تعبیر ہوا۔ خود حضرت سودہؓ کے والد نے نکاح پڑھایا اور چار سو درہم حق مہر طے پایا۔

حضرت سودہؓ نہایت سخی اور فیاض تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ان کی خدمت میں ایک تھیلی بھیجی۔ تھیلی لانے والے سے پوچھا اس میں کیا ہے؟ کہا درہم ہیں فرمایا کھجوروں کی طرح تھیلی میں درہم بھیجے جاتے ہیں۔ یہ کہہ کر تھیلی کا منہ کھولا اور اسی وقت تمام درہم تقسیم کر دیے۔ آپؓ چمڑے کی صنعت میں مہارت رکھتی تھیں۔ اس پیشے سے جو کچھ کماتیں اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے بے پایاں مسرت حاصل کرتیں۔

تمام ازواج مطہرات میں حضرت سیدہ سودہؓ ہی وہ واحد بلند بخت خاتون ہیں جن کی زندگی میں ہی ان کے سعادت مند بیٹے نے اللہ کی راہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔ حضورؐ سے سیدہ سودہؓ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ سابق شوہر حضرت سکرانؓ سے ان کا ایک بیٹا عبدالرحمٰن تھا۔ عہد

فاروقی میں جب اسلامی فوجیں عراق کو طاغوتی قوتوں سے آزاد کرانے کی مہم میں سردھڑ کی بازی لگا رہی تھیں تو عبدالرحمٰن بھی اس میں شامل تھے۔ عراق کی آزادی کا آخری معرکہ حضرت سعد بن وقاص کی زیر قیادت برپا ہوا، دیگر مسلمانوں کی طرح حضرت عبدالرحمٰن نے بھی ذوق جہاد سے سرشار ہو کر شجاعت و مردانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی مقام پر اپنی جان حق کی راہ میں قربان کر کے ابدی سرخروئی حاصل کی۔ اس طرح سیدہ سودہؓ ایک شہید بیٹے کی ماں ہونے کا لازوال شرف حاصل کر کے بارگاہِ خداوندی میں بلند مقام پر فائز ہوئیں۔

حضرت عائشہؓ سے آپ ؐ کا نکاح ہجرت مدینہ سے قبل ہی ہو چکا تھا۔ ہجرت مدینہ کے بعد رخصتی عمل میں آئی تھی۔ رخصتی کے بعد حضرت عائشہؓ بھی حضرت سودہؓ کے گھر میں ہی تشریف فرما ہوئیں۔ سیدہ سودہؓ ضعیف تھیں اور سیدہ عائشہؓ نو عمر تھیں۔ دونوں میں بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں مزاح بھی ہوتا تھا اور خوش طبع چھیڑ چھاڑ بھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک روز میں حضرت سیدہ سودہؓ اور حضورؐ کے ساتھ بیٹھی تھی، میں نے کھانے کے لیے خربوزہ تیار رکھا تھا۔ سیدہ سودہؓ سے کہا تم بھی کھاؤ، انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ میں نے ازراہِ مزاق کہا کھائیں گی یا منہ پر ماردوں؟ وہ خاموش بیٹھی رہیں اور کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ منظر دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ میں نے پیالے سے تھوڑا سا خربوزہ لیا اور سیدہ سودہؓ کے منہ پر مل دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دیکھ کر مسکرائے اور سیدہ سودہؓ سے فرمایا کہ تم بھی اس کے چہرے پر مل کر اپنا بدلہ لے لو۔ سیدہ سودہؓ نے بھی حکم مان کر خربوزہ میرے منہ پر مل دیا۔ آپ نے دیکھا اور مسکرا کر کہا یہ رہا نہ

بدلہ۔ یہ واقعہ واضح طور پر یہ بتا رہا ہے کہ وقت کا نبی اور نبی خاتمؐ اپنے افرادخانہ اور ازواج سے کس قدر ہنس مکھ اور بے تکلف زندگی گزارتے تھے۔ اس واقعہ میں شوہران کے لیے درس ہے کہ وہ گھر کے ماحول کو سلیقہ مندی کے ساتھ خوش گوار اور بے تکلف رکھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سنجیدہ طبیعت کے مالک تھے لیکن اس کے باوجود آپؐ صحابہؓ کی مجلس میں وقتاً فوقتاً مزاحیہ کلمات اور ظرافت بھرے جملے ارشاد فرماتے، اسی طرح اپنے اہلِ خانہ کے درمیان خوش گوار موڈ میں رہتے۔ گویا آپؐ نے اہلِ بیت اور صحابہ کے درمیان زندگی پوری طرح فطری انداز میں بسر فرمائی جو تکلفات سے بالکل پاک تھی اور آپؐ نے یہی تعلیم پوری امت کو دی ہے۔

حضرت سودہؓ کے مزاج میں مزاح کا عنصر بھی تھا۔ ایک دن آپؓ نے حضورؐ سے عرض کیا یا رسول اللہ! کل رات میں آپ کے پیچھے نفل نماز پڑھ رہی تھی، آپؐ دیر تک رکوع میں رہے، مجھے رکوع میں جھکے یوں محسوس ہوا کہ ابھی ناک سے نکسیر پھوٹ نکلے گی میں نے اس اندیشے سے کہ کہیں خون کے قطرے نیچے گرنے شروع نہ ہو جائیں اپنی ناک مضبوطی سے پکڑ لی۔ آپ یہ بات سن کر بے ساختہ ہنس پڑے۔

ام المومین حضرت سودہؓ نے زندگی کے آخری ایام میں اپنا حجرہ مبارک ام المومنین سیدہ عائشہؓ کے نام ہبہ فرما دیا تھا۔ سیرت نگاروں میں سیدہ سودہؓ کے سال وفات میں اختلاف ہے۔ زیادہ قرین صواب امام بخاری کی رائے ہے۔ امام بخاری کے مطابق سیدہ سودہؓ کا انتقال عہدِ فاروقی میں ۲۲ ہجری میں ہوا۔ سیدہ سودہؓ سے پانچ روایات منقول ہیں، ایک صحیح بخاری اور چار دیگر کتب احادیث میں درج ہے۔

اقتدار محمد خاں

بدلتے حالات میں علومِ اسلامیہ کی منصوبہ بندی

عبیداللہ فہد

■ ■ ■

عبیداللہ فہد *

بدلتے حالات میں علومِ اسلامیہ کی منصوبہ بندی

نوٹ: مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی حیدرآباد کے شعبہ اسلامیات میں منعقدہ (۲۴،۲۵/اپریل ۲۰۱۹ء) دو روزہ قومی سیمینار کا مختصر جائزہ

شدت پسندی کی مذمت

علومِ اسلامیہ کی ماہیت، موجودہ صورتِ حال اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کی ناگزیریت کا موضوع تھا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی حیدرآباد کے دو روزہ قومی سیمینار کا جو اسلامک اسٹڈیز کے جواں سال اور جواں فکر صدر پروفیسر محمد فہیم اختر ندوی کی قیادت میں ۲۴، ۲۵/اپریل ۲۰۱۹ء کو منعقد ہوا۔ ہم لوگ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے رختِ سفر باندھنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ سری لنکا کے انتہائی اندوہناک سانحہ نے قلب و ذہن کو معطل کر کے رکھ دیا۔ ۱۲/اپریل ۲۰۱۹ء کو سری لنکا میں مسیحی تہوار ایسٹر سنڈے کے موقع پر گرجا گھروں اور ہوٹلوں پر ۸ بم دھماکے ہوئے جن میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد تین سو سے تجاوز کر گئی، سینکڑوں زخمی ہوئے اور ہلاکتوں میں اضافہ کا خدشہ ظاہر کیا گیا۔[۱]

اخبارات کی اطلاع کے مطابق مقامی شدت پسند مسلم جماعت نیشنل توحید کے ان حملوں کی

* پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ای میل: drfahadamu60@yahoo.in

منصوبہ بندی میں ملوث ہونے کا شبہ ہے جسے بین الاقوامی تعاون بھی حاصل ہے۔ اگلے روز خبر آئی کہ دہشت گرد تنظیم داعش کے بیان میں واضح کیا گیا ہے کہ ان خودکش حملوں میں اس کے شدت پسند عناصر شریک تھے۔ بیان کے مطابق حملہ کرنے والوں نے امریکی اتحاد اور مسیحی باشندوں کو نشانہ بنایا۔ دوسری طرف اس گروپ کی حامی نیوز ایجنسی اعماق کی رپورٹوں پر نگاہ رکھنے والوں نے اس بیان کی صداقت اور حملوں میں داعش کے ملوث ہونے پر شبہات کا اظہار کیا ہے۔ سری لنکا کے نائب وزیر دفاع رووان وتیجے وردھنے نے خدشہ کا اظہار کیا کہ یہ حملے نیوزی لینڈ کے شہر کرائسٹ چرچ حملوں کا ردعمل ہوسکتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ حملے کسی انتہا پسند اسلامی گروپ نے کیے ہیں۔[۲]

ایک تو انسانی ہمدردی اور اسلام کی انسانیت نواز تعلیمات کا تقاضا تھا اور دوسری طرف اس علمی مذاکرہ کے مالی معاون مشہور عیسائی ادارہ ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ سے اتحاد و یگانگت کے اظہار کا لازمہ بھی کہ دو روزہ قومی مذاکرہ کے مباحث وموضوعات پر فکری تشدد اور مذہبی فرقہ واریت جیسے مسائل کا غلبہ رہا۔ افتتاحی تقریب کے آخر میں ہلاک شدگان سے اظہار یکجہتی کے لیے دو منٹ کی خاموشی بھی اختیار کی گئی۔

اسلامی تحقیق کے عصری مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے بھی فکری تشدد اور فرقہ وارانہ ذہنیت پر کھل کر تنقید کی۔ عالم اسلام کے مستند عالم وداعی دین شیخ یوسف القرضاوی کا حوالہ دیا جنھوں نے اسلامی ادبیات میں استعمال ہونے والی عربی اصطلاحات غلو، تنطع (انقطاع) اور تشدد پر خاصا تنقیدی مواد فراہم کر دیا ہے۔[۳] وہ لکھتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی المسند میں امام نسائی اور امام ابن ماجہؒ نے اپنی السنن میں، امام حاکمؒ نے اپنی المستدرک میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> **ایّاکم والغلوّ فی الدین فانّما هلک من هلک قبلکم بالغلو فی الدین.**[۴] تم دین میں غلو اور انتہا پسندی سے بچو، تم سے پہلے کے لوگ غلو اور انتہا پسندی ہی کے باعث ہلاک ہوئے۔

دوسری حدیث صحیح مسلم کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **هلک المنطِعُون .**[۵]

آپؐ نے تین بار یہ جملہ دوہرایا۔ امام نوویؒ اس کی شرح کرتے ہیں کہ مراد وہ لوگ ہیں جو بال کی کھال نکالتے ہیں۔ شدت پسندی کا رویہ اپناتے ہیں اور قول وعمل میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔

۲۵/اپریل کی شام ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ شیورام پلّی کے کیمپس میں افتتاحی تقریب منعقد ہوئی تو بعض مقررین ڈاکٹر پیکم ٹی سموئیل ڈائرکٹر کی استقبالیہ تقریر سے اس قدر متاثر ہوئے اور ان کے زور بیان اور طرزِ استدلال کو اس قدر سراہا کہ وہ بھول گئے کہ اس علمی مذاکرہ کا موضوع اسلامی علوم کی ماہیت اور مستقبل کی منصوبہ بندی سے متعلق ہے۔ تنہا مقررین کیوں موردِ الزام قرار پائیں۔ تقریباً سارے حاضرین ڈاکٹر سموئیل کی ساحرانہ خطابت کے اسیر ہوئے اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مفاہمت کی راہیں تلاش کرنے لگے۔ شاید یہ سری لنکا کے خونیں حادثہ کے پس منظر میں ضروری بھی تھا۔ فکری تشدد اور مذہبی شدت پسندی نئے نئے گل کھلاتی ہے اور پیروانِ مذہب کی جگ ہنسائی کا ذریعہ بنتی ہے۔ ہمارے علما کے اندر یہ طرز تخاطب اور ساحرانہ اندازِ تکلم کمیاب ہے۔

تفہیم دین کا علمی منہج

افتتاحی تقریب میں پروفیسر عبدالعلی سابق صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی نے مذہب کے علمی اور دانشورانہ مطالعہ پر زور دیا اور اسے اسلامک اسٹڈیز کا خصوصی منہج بتایا۔ میں نے اپنی ایک تحریر میں زور دیا تھا کہ اسلامی فکر، نظریہ اور فلسفہ کے اجتماع سے عبارت ہے، نظریہ اس لیے ہے کہ وہ دوسرے رجحانات، افکار اور طرزِ زندگی کے مقابلے میں جامع اور مکمل ہے، انسانیت کے لیے نافع اور قابل قبول ہے اور اسی لیے غلبہ واقامت کا آرزومند ہے۔ وہ فلسفہ اس لیے ہے کہ اس فکر میں وسعت ہے، تنوع ہے، گہرائی ہے۔ دوسرے افکار اور عطیات کو اپنے اندر سمونے اور ڈھالنے کی پوری گنجائش ہے۔ تہذیب وثقافت اور مظاہر کے بدلتے سانچوں کو اپنانے کی روایت ہے۔[۶]

میری یہ تحریر شائع ہوئی تو بعض حلقوں سے ناخوش گوار تاثرات کا اظہار ہوا۔ آج پروفیسر عبدالعلی نے مذہب کے مطالعہ کے لیے علمی اور دانش ورانہ منہج اپنانے پر زور دیا تو قدرے سکون کا احساس ہوا۔ میری گفتگو اسلامی تحقیق کے عصری مسائل ومشکلات پر تھی جو صدر اجلاس پروفیسر اقتدار محمد خاں کے لیے نامانوس ثابت ہوئی۔ وہ کسی روایتی طرز خطاب اور موروثی مسائل وموضوعات پر تبادلہ

خیال کی امید لگائے بیٹھے تھے ویسے بھی فکری موضوعات سے ہر شخص کو دلچسپی نہیں ہوتی۔ تاہم بعض شرکاء نے بحث میں حصہ لیا اور محفل میں گرمی آ گئی۔ گرمیٔ گفتار بھی اور گرمیٔ جذبات بھی۔

ڈاکٹر وارث مظہری کو میرے اٹھائے ہوئے فکری مسائل وترجیحات سے اختلاف نہ تھا۔ انھیں تشویش اس پر تھی کہ فقہ الاقلیات مقاصد شریعت اور خواتین کی سماجی حصہ داری جیسے موضوعات پر مطالعہ وتحقیق کا کام کون کرے۔ اربابِ مدارس کو فرصت ہے اور نہ دلچسپی وہ مدرسہ کی مخصوص تدریسی فضا سے باہر آنے کے لیے فکرمند ہیں نہ مدارس کا گراں بار نظام الاوقات ان مسائل پر بحث وتدبر کے لیے متحمل ہوسکتا ہے۔ عصری علوم کے ماہرین علوم شریعت اور علوم فقہ واصول فقہ کے شناور نہیں۔ انھیں علمی باریکیوں کا ادراک ہے نہ انھیں ان میں تخصص حاصل ہے۔ پھر بلّی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے۔ اس اہم مگر پُرخطر منصوبہ کو ہاتھ کون لگائے؟

ڈاکٹر وارث مظہری فکر دیوبند کے علم بردار ہیں۔ دل دردمند رکھتے ہیں اور عصری ادراک کا نایاب تحفۂ خداوندی بھی۔ میں نے عرض کیا آپ پہل کریں دوسرے فضلا اقتدا کریں گے۔ فضلائے مدارس جو عصری جامعات سے وابستہ ہیں وہ آگے بڑھیں اور ان فکری موضوعات کو مطالعہ وتحقیق کی جولان گاہ بنائیں۔ ویسے علم وتحقیق پر کسی طبقہ کا اجارہ نہیں۔ جو لوگ ان موضوعات سے دلچسپی لیں گے اُن کے لیے ناگزیر ہوگا کہ عربی زبان سیکھیں اور مصادر تک رسائی حاصل کریں۔

طلاقِ ثلاثہ پر اجماع کا دعویٰ

میری گفتگو کے دوران ایک مجلس میں تین طلاقوں کی شرعی حیثیت کا مسئلہ بھی زیرِ غور آیا تھا اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے موقف کو میں نے فقہ حنفی کی ترجمانی سے تعبیر کیا تھا اور اس موضوع پر تحقیق کرنے کی دعوت دی تھی۔ سید محمد فضل الرحمٰن چشتی لیکچرر جامعہ ہمدرد انجینئرنگ کا پس منظر رکھتے ہیں، انگریزی اچھی بولتے ہیں اور خطابت کا ملکہ بھی رکھتے ہیں۔ انھوں نے بڑے طمطراق سے دعویٰ کیا کہ ایک مجلس میں تین طلاقوں کو ایک طلاق قرار دینے کا فتویٰ دورِ جدید کے بعض مسلمان فرقوں کا ہے۔ تاریخ اسلام میں انھیں طلاق مغلظہ اور ناقابل رجوع قرار دینے پر اجماع رہا ہے۔ یہ محض فقہ حنفی کا فتویٰ نہیں ہے۔

سپریم کورٹ کے حالیہ تاریخ ساز فیصلہ اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے ذریعہ اس پر قانون سازی کی محاذ آرائی نے اس مسئلہ کو بڑا نازک اور عوامی بحث کا موضوع بنا دیا ہے۔ اسی لیے میڈیا میں اس حساس موضوع پر گفتگو کرنا مناسب نہیں ہے۔ مگر علمی مذاکرہ کے مخاطب علماء اور دانش ور تھے اور اسلامی علوم کے ماسٹرز اور تحقیق کے طلبہ و طالبات بھی۔ مناسب تھا کہ اس موضوع پر کھل کر اظہارِ خیال ہو۔

راقم نے تسلیم کیا کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو طلاق مغلظہ قرار دینے کی رائے تاریخ اسلام میں اکثر فقہاء و علماء کی رہی ہے مگر اس پر اجماع کا دعوی درست نہیں ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (۱۲۶۳-۱۳۲۸ء) اور علامہ ابن قیم الجوزی (۱۲۹۲-۱۳۵۰ء) کی رائے سب کو معلوم ہے۔ وہ ان طلاقوں کو ایک طلاق قرار دیتے تھے اور اسی لیے قابل رجوع مانتے تھے۔ دور رسالت میں، عہد صدیقی میں اور عہد فاروقی کے ابتدائی سالوں میں ایک مجلس کی تین طلاقیں ایک مانی جاتی تھیں اور رجوع کرنے کا حق باقی رہتا تھا۔ احادیث و آثار اس کی تائید میں موجود ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح پر قدغن لگانے کے لیے اجتہاد کیا اور اس اجتہاد کو صحابہ کرام نے تسلیم کیا۔ انھوں نے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو طلاق قطعی و مغلظہ قرار دیا۔ مگر اسلامی تاریخ میں فقہاء و محدثین کے درمیان اس موضوع پر اختلاف ہمیشہ باقی رہا۔

میں نے سید محمد فضل الرحمٰن چشتی کو یاد دلایا کہ تطلیقات ثلاثہ کے حساس موضوع پر ۴-۶ رنومبر ۱۹۷۳ء کو گجرات چیمبر آف کامرس حیدرآباد میں ایک علمی مذاکرہ منعقد ہوا تھا جس میں مختلف مکاتب فکر کے علماء جمع ہوئے تھے۔ انھوں نے جو قرارداد منظور کی تھی اس میں صراحت ہے کہ ایک مجلس کی تین طلاقوں کو طلاق مغلظہ قرار دینے پر اجماع کا دعویٰ درست نہیں ہے۔ تاریخ اسلام میں یہ مسئلہ آغاز سے مختلف فیہ رہا ہے۔ اس علمی مذاکرہ میں جن حضرات نے شرکت کی تھی وہ جید اور مستند علمائے دین تھے جیسے:

— مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (صدر آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت، نئی دہلی)
— مولانا محفوظ الرحمٰن قاسمی (مدرسہ بیت العلوم مالیگاؤں)
— مولانا سعید احمد اکبر آبادی (ڈین فیکلٹی آف دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)
— مولانا مختار احمد ندوی (امیر جمعیت اہل حدیث، دہلی)

— شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری (فرزند شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری)
— مولانا سید احمد قادری (مدیر ماہنامہ زندگی رامپور)
— مولانا سید حامد علی (سکریٹری جماعت اسلامی ہند، دہلی)
— مولانا شمس پیرزادہ (ڈائرکٹر الدعوہ ٹرسٹ، ممبئی)[۷]

سید محمد فضل الرحمٰن چشتی کو میں نے یہ بھی بتایا کہ پاکستان کے نامور اہلِ سنت عالم پیر محمد کرم شاہ ازہری رکن مرکزی رویت ہلال کمیٹی پاکستان اور مدیر ماہنامہ ضیائے حرم لاہور نے بھی طرفین کے دلائل کتاب وسنت کو دیانت اور متانت کے ساتھ نقل کرنے کے بعد یہی رائے قائم کی ہے کہ مقاصدِ شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے ایک مجلس کی تین طلاقوں کو ایک طلاق تصور کیا جائے کہ دورِ رسالت کا اسوہ یہی ہے۔ حضرت عمرؓ اور صحابہ کرام کے اجتہاد کی نوعیت عارضی اور وقتی تھی۔ انھوں نے مقاصد شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہاد کیا تھا۔ آج کے حالات میں مقصود شریعت کا تقاضا ہے کہ دورِ رسالت کی سنت کی طرف واپسی ہو۔[۸]

تجدد یا تجدید سنت

میں نے اپنی گفتگو میں دورِ رسالت میں خواتین کی مسجد نبوی میں حاضری اور نمازوں کی ادائیگی کی سنت کا بھی حوالہ دیا تھا۔ بدقسمتی سے بعد کے ادوار میں مختلف عوامل ومحرکات کے تحت مساجد کے دروازے خواتین کے لیے بند کردیے گئے۔ سید محمد فضل الرحمٰن چشتی نے لیت ولعل کے بعد دورِ رسالت کی اس سنت کو تسلیم کیا مگر شرط لگائی کہ خواتین کے آنے جانے کے لیے علیحدہ دروازہ ہوتا کہ اختلاط سے بچا جاسکے۔

میں نے عرض کیا کہ خواتین کی مسجدوں میں حاضری کی سنت کا احیاء ہوتو ضروری تدابیر اور وسائل وجود میں آجائیں گے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ علمائے دین کا ذہن اتنا مسموم ومشکوک ہوگیا ہے کہ وہ اس مسئلہ کو تجدد کا شاخسانہ تصور کرتے ہیں۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنے مضمون میں کھل کر لکھا ہے کہ

بعض تجدد پسند مرد اور خواتین اس بات کو عورتوں کی تذلیل قرار دیتے ہیں

> کہ اُن کو جماعت میں شریک ہونے سے روکا جائے۔ یہ محض ناسمجھی اور کم فہمی کی بات ہے۔ یہ تذلیل نہیں، رعایت ہے۔ یہ اُن کی حق تلفی نہیں بلکہ ان کے لیے چھوٹ ہے۔[9]

حالانکہ مضمون نگار یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خواتین کو مسجد میں نماز پڑھنے سے روکنا، اسے شجر ممنوعہ تصور کرنا اور اسے دین کا قطعی حکم ماننا درست نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض چیزوں کی اجازت دی اور اسے منسوخ فرما دیا، خود نماز کے سلسلے میں بعض طریقے منسوخ کیے گئے۔ اسی طرح آپ نے مسجد میں عورتوں کے نماز پڑھنے کو بھی مکمل طور پر منع فرما دیا ہوتا اور آپؐ جو بات بھی فرماتے تمام مسلمان مرد و عورت اسے بطیّبِ خاطر قبول کر لیتے لیکن یہ ضروری ہے کہ موجودہ حالات کے اعتبار سے اس اجازت کو محدود کیا جائے جیسا کہ بعض صحابہ نے اس اجازت کو بعض نمازوں تک اور بعض نے عمر دراز عورتوں تک محدود کر دیا ہے۔

یہاں دو بنیادی سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ اگر یہ سنت دورِ رسالت میں بلا اختلاف قائم تھی اور خواتین کے مسجدوں میں آنے جانے پر کوئی بندش نہ تھی بلکہ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح حکم موجود ہے کہ خواتین کو مسجدوں میں آنے سے روکا نہ جائے تو اس کا حکم تجدد پسندی کے زمرہ میں داخل کیسے ہوگا؟ تکریمِ خواتین کا تقاضا اور احیائے سنتِ صحیحہ کا مطالبہ تو یہ ہے کہ خواتین کو مساجد میں باجماعت نماز کی ادائیگی سے روکا نہ جائے۔

۲۔ اگر دورِ رسالت میں خواتین کی مسجدوں میں نماز کی ادائیگی محدود و مشروط نہیں تھی تو اس کے برعکس بعض صحابہ کی اجتہادی آرا کو اسوہ کیسے بنایا جاسکتا ہے؟

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے خواتین کو مساجد میں داخل ہونے اور نماز ادا کرنے کی اجازت تو دی مگر اسے مشروط کر دیا۔ وہ ریلوے اسٹیشن، بس اسٹینڈ، ایئر پورٹ، عدالتوں اور اسپتالوں سے قریب کی مساجد میں خواتین کو داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ نماز تراویح کی ادائیگی کے لیے مسجد سے متصل پڑوس کے گھروں میں یا خواتین کے لیے تعمیر کردہ ہالوں میں بھی انھیں اجازت دی جاسکتی ہے۔ تعلیم گاہوں میں بھی خواتین کے لیے مصلیٰ بنانے کی گنجائش ہے۔ بازار اور ہائی وے کی

مسجدوں میں خواتین کے حصے اور گوشے میں باتھ روم کا نظم اُن کے لیے سہولت کا باعث ہے۔ دعوتی واصلاحی ضروریات کے لیے شہر کی بعض مسجدوں سے قریب خواتین کے لیے اجتماع ہال کی تعمیر پر بھی انھیں اعتراض نہیں ہے کیوں کہ جمعہ کے بیانات، دعوتی اجتماعات، سیرت کے جلسوں، مدارس کے اصلاحی پروگراموں اوراصلاحِ معاشرہ کی کانفرنسوں سے خواتین کم ہی استفادہ کر پاتی ہیں۔[۱۱]

دورِرسالت میں خواتین کی نمازوں میں شرکت کی تفصیلات احادیث میں موجود ہیں وہاں نہ شرائط کا تذکرہ ہے نہ تحدیدات کا۔ یہ تحدیدات علمائے دین کے منفی ذہن کی پیداوار ہیں۔نماز جو تہذیب مسلمان کو سکھاتی ہے اور جن آداب وشرائط کی تعلیم دیتی ہے اور خواتین کے گھر سے نکلنے کے جو آداب شریعت میں بیان ہوئے ہیں اُن کی پابندی اور مکمل رعایت اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے لیے کافی ہے۔ مزید تحدیدات وشرائط کا نفاذ اور فتنہ کا خانہ ساز تصورانسانی ذہن کی کارفرمائی ہے اور بس۔

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی نے میری گفتگو پر تبصرہ کیا کہ طلاقِ ثلاثہ کے معاملہ میں راقم نے حنفی مسلک کی ترجمانی بمقابلہ اسلام کی ترجمانی کی جو اصطلاح استعمال کی ہے وہ درست نہیں ہے۔ اس سے نئی نسل غلط فہمی میں مبتلا ہوسکتی ہے کہ حنفی مسلک کا دائرہ اسلام سے باہر ہے۔ راقم نے خوش دلی سے اُن کی یہ اصلاح قبول کی۔ بلاشبہ حنفی فقہ مستند ومعتبر فقہ ہے مگر بسا اوقات فقہی جمود ورکود اور عصری حسیت کے فقدان سے اسلام کی غلط ترجمانی ہونے لگتی ہے اس میں بڑے تدبر اور ذکاوت کی ضرورت ہے۔

پروفیسر محمد فہیم اختر ندوی نے خواتین کے مسئلہ پر اپنا ذاتی تجربہ بیان کیا۔انھوں نے مولانا آزلاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی عارضی مسجد میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے خواتین کا نظم کیا۔اردو زبان میں مختصر خطبہ بھی اُن کے معمولات میں شامل ہے۔ الحمد للہ اس کے خوش گوار اثرات مرتب ہورہے ہیں۔بعض خواتین نے بتایا کہ انھوں نے زندگی میں پہلی بار مسجد میں منبر ومحراب کے نظام کو دیکھا ہے اور خطبہ دینے کے طریقہ واسلوب کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے۔

اس اولین اجلاسِ عمل کی صدارت پروفیسر اقتدار محمد خاں نے اور نظامت ذیشان سارہ نے کی۔ نظام الاوقات میں تبدیلی پر پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی چراغ پا ہوگئے۔ وہ بار بار ہمت مجتمع کرتے کہ شاید اب اُن کے خطاب کی باری ہے مگر جناب صدر اُن کو خاطر میں نہ لاتے اور آخر کار جب پیمانہ

لبریز ہوگیا تو وہ بول ہی پڑے اور صدر کو معذرت کرنا پڑی۔ علمی مذاکروں میں ہر چھوٹی بڑی بات قابل توجہ ہوتی ہے اور ذرا سی بدنظمی بار خاطر بن جاتی ہے۔

اصحاب دانش کی جولان گاہ

دوسرے اجلاس عمل کی صدارت مجھے کیا سونپی گئی کہ طلبہ وطالبات کے سوالات اور اُن کی ذہنی الجھنوں کے تمام تیر میری طرف موڑ دیے گئے اور استاذ الاساتذہ پروفیسر عبدالعلی اور پروفیسر اقتدار محمد خاں نے یہ کہہ کے مجھے اعصاب زدہ بنا دیا کہ آپ کی صدارت کا کمال دیکھنے کے لیے ہم یہاں موجود ہیں۔ لیجیے رہی سہی کسر پوری ہوگئی اب یہ حال ہوگا کہ

نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن

اس اجلاس کے مقالہ نگاروں میں جامعہ ہمدرد نئی دہلی کے صاحب علم استاذ ڈاکٹر وارث مظہری، طالب تحقیق تعظیم حیدر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے نوجوان استاد ڈاکٹر محمد مسیح اللہ اور ڈاکٹر محمد اسامہ فلاحی، ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ کے سینئر استاذ سید وحید اللہ حسینی اور عالیہ یونیورسٹی کلکتہ کے سید عبدالرشید شامل تھے۔ انھوں نے علوم اسلامیہ کی مختلف جہتوں پر فاضلانہ مقالات پڑھے اور مختصر وقت میں اپنے علمی موقف کا دفاع کیا مگر بعد میں سوالات کا رخ میری طرف مڑ گیا اور خواہی نخواہی مجھے لب کشائی کرنی پڑی۔

مسز انصار بیگ کی الجھن اسلامک اسٹڈیز کے بیشتر طلبہ وطالبات کی الجھن تھی۔ اسلامک اسٹڈیز کی ماہیت، فطرت اور دائرۂ کار سے ناواقف بیشتر اصحاب علم جو دوسرے فنون پر تخصص رکھتے ہیں، اسی اضطراب کا اظہار کرتے اور اپنی طرف سے مختلف جوابات فراہم کر کے مشکلات میں اضافہ کا سبب بن جاتے ہیں۔ انھوں نے رفاہی وسماجی خدمات کے مختلف حکومتی اور غیر حکومتی منصوبوں کا ذکر کیا اور اُن میں اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ وطالبات کا مستقبل تلاش کرنے کی درخواست کی۔

راقم نے مسز انصار بیگ کی تحسین کی مگر ساتھ ہی وضاحت کی کہ متخصصین علوم اسلامیہ اور ماہرین اسلامیات کی حیثیت اصحاب فکر ودانش Think Tank کی ہے وہ امت کی علمی وفکری رہنمائی کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ متوازن، انسانیت نواز اور ترقی یافتہ تعبیرات وتشریحات کے ذریعہ مذہب

کی ترجمانی کرتے ہیں۔نئی نسل کو احساسِ کمتری سے نکالتے اور مرعوبیت سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔تشدد، انتہا پسندی، اشتعالی فکر اور ہیجان خیز نظریات سے نوجوانوں کو ہوشیار کرتے ہیں۔ یہ فکری وعلمی رہنمائی عصری جامعات کے دردمند، سنجیدہ اور احکام اسلام کی پاسداری کرنے والے متدین اساتذہ اور محققین ہی کر سکتے ہیں اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ واساتذہ کو اپنا یہ مشن ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ یہی اُن کا میدانِ عمل ہے۔یہی اُن کی جولان گاہ ہے۔

با حجاب معلّمہ ذیشان سارہ کی الجھن تھی کہ طلبہ وطالبات کے اندر علم کی طلب نہیں ہے۔اسلام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی پیاس محسوس نہیں ہوتی۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری محنت رایئگاں جارہی ہے۔ ہر جدو جہد، ہر جفاکشی، ہر منصوبہ بندی ناکام ہورہی ہے۔ میں نے اُن کے احساس کی پذیرائی کی اور اُسے قابل قدر قرار دیا مگر اس امر کا بھی اظہار کیا کہ پچھلے بیس سالوں میں اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ واساتذہ میں انقلابی تبدیلی دیکھنے کو ملی ہے اب سائنس وکامرس کے گریجویٹ بھی اور انگلش میڈیم اسکولوں کے فارغین اور مدارس دینیہ کے فضلا بھی اس مضمون کا رخ کرنے لگے ہیں جن کی وجہ سے تدریس وتحقیق کے معیار میں بہتری آئی ہے۔عالمی ومقامی حالات میں برق رفتار تبدیلی نے بھی اس فن کے طلبہ واساتذہ پر اثر ڈالا ہے۔ابلاغیات کے سرعت انگریز انقلاب کی وجہ سے بھی اصلاح وترقی کے امکانات شروع ہوئے ہیں۔امید افزا ماحول نے ماہرین اسلامیات کے اندر خوش گوار تبدیلی پیدا کی ہے اس لیے مایوسی وپژمردگی نامناسب ہے۔

ثروت سمیہ کا سوال نسوانی ذہن کا عکاسی تھا۔نصابِ تعلیم کے اندر مسلم خواتین کے عطایا و مسائل کی شمولیت پر انھوں نے زور دیا۔اُن کے اسی مشاہدہ اور سوال کا اثر تھا کہ شعبہ اسلامک اسٹڈیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے بورڈ آف اسٹڈیز کے حالیہ اجلاس مورخہ ۲۸ مئی ۲۰۱۹ء میں اسلام میں خواتین کی حصہ داری کے موضوع پر ایم۔اے کے نصاب میں ایک نئے کورس کو منظوری دی۔[۱۱] میں نے اُن کے احساس کی تائید کی۔

حالات کا جبر اور خوش گوار تبدیلی

ڈاکٹر وحید اللہ حسینی نے سماج میں مثبت تبدیلی نہ آنے کا شکوہ کیا اور علمائے دین کے تقلیدی

رویہ اور منفی رجحان کی شکایت کی۔ راقم نے اُن کی شکایت کا کرب محسوس کیا۔ مگر یہ بھی عرض کیا کہ حالات کے جبر نے علماء اور دانش وروں کو سپر ڈالنے پر آمادہ کیا ہے۔ تبدیلی آرہی ہے گو رفتار بہت سست ہے۔ میں نے بطورِ مثال ۲۴ر جولائی ۲۰۱۸ء کو سپریم کورٹ میں سبری مالا مندر کے سلسلے میں ٹراونکور دیوا سوم بورڈ کیرالہ کی جانب سے وکیل دفاع اے ایم سنگھوی کے بیان کا حوالہ دیا۔ وکیل نے اس مندر میں دس سے اکیاون سال کی عمر کی خواتین کے داخلہ پر پابندی کا دفاع کرتے ہوئے مسلم معاشرہ میں کارفرما اس روایت کو بطور مثال پیش کیا کہ مسجدوں میں مسلم خواتین کے داخلہ پر پابندی عائد ہے۔[۱۲] اخبارات میں سنگھوی کے اس بیان کی اشاعت کے بعد مسلم علماء اور دانش ور اپنی صفائی میں لگ گئے۔

دہلی کی شاہی مسجد کے امام سید عبداللہ بخاری، مسجد فتح پوری دہلی کے امام مفتی مکرم احمد، شاہ مردان مسجد کربلا جور باغ، دہلی کے امام مولانا سید طالب حسین نے دوسرے ہی روز اپنے تنقیدی بیانات اخبارات میں شائع کرائے۔ الیکٹرانک میڈیا میں پُر زور تردید کی کہ مسجدوں میں خواتین کے داخلہ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ نماز جمعہ اور عیدین میں انھیں مسجد میں آنے اور نماز ادا کرنے کا پورا اختیار ہے۔ حرمین شریفین میں خواتین کا داخلہ اور نمازوں کی ادائیگی معمولات میں شامل ہے۔[۱۳]

یہ تبدیلی خوش آئند ہے۔ حالات کے حصار میں سہی، مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے دفاعی موقف بھی غنیمت ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جمود ٹوٹ رہا ہے۔ ادراک کی آمد آمد ہے۔ ضرورت ہے کہ علمائے دین اصلاح وتجدید کے عصری تقاضوں کی رعایت جلد کرلیں اور مثبت تبدیلیوں کا آغاز کردیں۔ ۲۰۱۶ء میں مولانا سید خالد رشید فرنگی محلی نے لکھنؤ کی عیدگاہ میں خواتین کو نماز عید ادا کرنے کی ترغیب دی اور نماز کے بعد میڈیا کے روبرو انھوں نے بیان دیا کہ کم از کم عیدین کے موقع پر خواتین کی شرکت کا خصوصی اہتمام کیا جائے۔[۱۴]

یہ خبریں بے قاعدہ اور عارضی سہی، خوش آئند ضرور ہیں اور ان سے امید افزا پیغام ملتا ہے۔

جناب سید عبدالرشید نے فضلائے مدارس اور عصری جامعات کے دانش وروں کے درمیان قربت کی گنجائش کے متعلق سوال کیا۔ میں نے ہر دو فکری دھاروں کے سنجیدہ اور دین دار افراد کے درمیان قربت کو وقت کی ناگزیر ضرورت قرار دیا۔ دونوں طبقوں کے درمیان موجود خلیج کے ختم ہونے ہی میں امت کا فائدہ ہے۔

سیمینار سے قدرے فراغت ہوئی تو اطراف وجوانب پر نگاہ پڑنا فطری تھا۔ مہمان خانہ کی اقامت تکلیف دہ نہ تھی مگر میزبانوں کے امتیازی رویہ پر نوحہ خواں ضرور تھی۔ ہمارے بعض ساتھیوں کی رہائش گاہیں زیادہ کشادہ اور آسائش کا باعث تھیں غسل خانہ کے لوازمات کے اعتبار سے بھی اور فرنیچر کی فروانی کے اعتبار سے بھی۔ بعض طلبہ نے اس امتیاز کا ذکر کیا تو میں نے انھیں علامہ محمد اقبال کے وہ اشعار سنائے جو انھوں نے اپنے بیٹے جاوید کو مخاطب کر کے کہے تھے:

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی
اُس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شانِ بے نیازی
کنجشک وحمام کے لیے موت
ہے اس کا مقام شاہبازی

تاہم اس کا افسوس ضرور رہا کہ دیوار گھڑی کی سوئیاں ۸ کے ہندسے پر ٹھہر گئی تھیں، جیسے وقت کی رفتار رک گئی ہو اور غسل خانے کا شاور تعاون کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوا۔ عاطف عمران اور محمد عامر کی دست گیری نے بعض مسائل ضرور حل کر دیے۔ ان دونوں طالب علموں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اسلامیات میں ماسٹرز کی تکمیل کی تھی اور یہاں علی گڑھ تہذیب سخاوت کا فریضہ ادا کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔

مکہ مسجد کا جمال

۲۵/اپریل کی شام احباب کی رفاقت میں مکہ مسجد میں نماز مغرب کی ادائیگی کی منصوبہ بندی کے پیچھے جناب ایاز شیخ اور ان کے لخت جگر احمد الشیخ کا ذوق دینی کارفرما تھا۔ احمد نے صالح طبیعت پائی ہے اور آداب فرزندی سے بخوبی واقف ہیں۔ انھیں یہ تربیت اور یہ فیضان نظر اپنے والد سے ملا ہے۔ اُن کی بائیک پر حیدرآباد شہر کی گلیوں کی سیر کرتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اپنے بڑے بیٹے مثنیٰ فہد کی قیادت میں ہوں۔ بے تکلفی، اپنائیت، اخلاص، دینی واصلاحی ذہن اور تحریکی مزاج۔ ان سب کا

اجتماع نظر آیا احمد کی شخصیت میں۔

کرنولی کے عبدالغفار عمری کی روایت ہے کہ مکہ مسجد کا سنگ بنیاد دسمبر ۱۶۱۷ء میں سلطان محمد قطب شاہ نے رکھا تھا۔ اس کی تعمیر میں کم وبیش ۷۷ سال لگے جبکہ تاج محل کی تعمیر تیس برس میں مکمل ہوگئی تھی۔ مسجد کی تعمیر میں شاہ نگر علاقہ کے ایک ہی پہاڑ کے پتھر استعمال کیے گیے جو سرخی مائل تھے۔ اس مسجد کا تاریخی نام ''بیت العتیق'' تھا مگر اس کی تعمیر میں مکہ مکرمہ کے بعض پتھر بھی کام آئے اس لیے اسے مکہ مسجد کے نام سے موسوم کیا گیا۔

۱۵۹۱ء میں محمد قطب شاہ نے حیدر آباد میں چار مینار کی تعمیر کر کے اس شہر کی بنیاد رکھی اور چار مینار کے قریب ہی ۱۵۹۷ء میں جامع مسجد تعمیر کی۔ آبادی میں اضافہ ہوا تو مسجد ناکافی ہوگئی چنانچہ محمد قلی قطب شاہ نے ایک دیگر مسجد کی تعمیر کا ارادہ کیا مگر ۱۶۱۲ء میں وہ چل بسے اور ان کے داماد سلطان محمد قطب شاہ نے باگ ڈور سنبھالنے کے بعد ایک بڑی مسجد کی تعمیر کے لیے سہ رکنی کمیٹی تشکیل دی جس کے ایک رکن وہ خود تھے۔ دوسرے دو ارکان میر فضل اللہ بیگ اور رنگیا چودھری تھے۔ چنانچہ اس جامع مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور یہی آگے چل کر مکہ مسجد کہلائی۔

مسجد کی تعمیر مکمل نہ ہوسکی اور سلطان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے کم سن فرزند عبداللہ قطب شاہ نے حکمراں بننے کے بعد مکہ مسجد کی تعمیر کو آگے بڑھایا۔ اس سلطان کا بھی جلد ہی انتقال ہوگیا۔ ۱۶۷۲ء میں ابوالحسن تانا شاہ کے دور حکومت میں تعمیری کام کم ہو پایا۔ ۱۶۸۹ء میں قطب شاہی حکومت سلطنت میں ضم ہوگئی تو ۱۶۱۴ء میں اورنگ زیب عالم گیرؒ نے بقیہ تعمیراتی کام مکمل کرائے۔ اس مسجد کی اونچائی ۷۰ قدم ہے۔ نماز کے لیے ۶۷ میٹر طویل اور ۵۴ میٹر چوڑائی کی جگہ فراہم کی گئی ہے۔ مسجد کے اندر بیک وقت تین ہزار اور صحن میں دس ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے۔

دور سے مسجد کا جمال ہر شخص کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اگر ایمان کی شمع دل میں فروزاں ہو تو وہ بیتابانہ دوڑ پڑتا ہے، قدموں میں تیزی آجاتی ہے، جذبات میں امنگ اور حوصلہ جاگ اٹھتا ہے لیکن اندر داخل ہونے کے بعد جب وہ نماز کی نیت باندھتا ہے تو مسجد کا جلال اسے مبہوت ومتحیر کیے بنا نہیں چھوڑتا۔ مرمت اور تزئین کا کام جاری ہے مگر مسجد کی شاندار تاریخ ان ارائشی اقدامات سے بلند ہے بہت بلند۔

احمد شیخ نے مسجد سے نکل کے قیادت سنبھالی۔ ان کے چچا اور والد کا ہم رکاب تھے ہی۔ حیدرآباد کی بریانی کی تلاش میں نکلے مگر تحریک اسلامی اردو تنظیم طلبہ کی دعوتی، دینی اور اصلاحی جدوجہد پر احمد کے سوالات بڑے پریشان کن تھے۔ نوجوان نسل روایتی بیانیہ سے گریزاں ہے۔ علمائے دین کا کلامیہ اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ دینی ادب کا طرز استدلال، اندازِ تکلم، تعبیر دین کا اسلوب، سماجی ونفسیاتی مسائل پر گفتگو کرنے کا طریقہ، یہ سب نوجوانوں کے لیے ناکافی اور غیر تسلی بخش ثابت ہورہے ہیں۔ احمد کی گفتگو نے مجھے مجبور کردیا کہ تعبیر دین کے جدید بیانیہ کی ناگزیریت کو محسوس کروں۔

اقبال اکیڈمی کی زیارت

ہم دم دیرینہ ایاز شیخ صدر شعبہ تحقیق اقبال اکیڈمی حیدرآباد کی محبتوں اور عقیدتوں کا خراج پچھلے کئی سالوں سے پیہم وصول ہورہا ہے۔ وہ تحریک اسلامی کے جاں باز سپاہی ہیں ان کے اہل بیت بھی وفاکشی اور صداقت شعاری کے آداب سے واقف ہیں۔ راہ ورسم وفا نبھاتے جوان کی منزلیں طے کرلی ہیں اور اب تو زبان حال سے اعلان کررہے ہیں:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

گلبرگہ کے خانقاہی خاندان کے اس چشم وچراغ نے مادّی منفعتوں اور روحانی کثافتوں کو ٹھوکروں پہ رکھا ہے۔ آزمائشوں سے گزر کے ثابت قدمی اور ایمان واستقامت کی مثال قائم کی ہے۔ خدا انھیں حاسدوں کے حسد سے اور دشمنوں کے انتقام سے محفوظ رکھے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے علمی مذاکرہ میں شرکت کی اطلاع انھیں ملی تو اصرار کر کے ایک دن مزید قیام کی راہ انھوں نے بڑی محبت سے ہموار کی۔ ۲۶/اپریل کی شام اقبال اکیڈمی کے نام معنون ہوئی۔ یہ اکیڈمی گلشن خلیل روبرو گارڈن ٹاور ٹینک کی تیسری منزل پر واقع ہے۔

اقبال اکیڈمی ۱۹۵۹ء میں سید خلیل اللہ حسینی کے ہاتھوں قائم ہوئی۔ فکر اقبال کی توسیع وتحقیق کے لیے مرحوم حسینی نے ملت اسلامیہ کی ترقی واستحکام کے لیے مجلس تعمیر ملت بھی قائم کی تھی۔ اس اکیڈمی

نے ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۷ء میں فکر اقبال پر دو قومی سیمینار منعقد کرنے کے بعد ۱۹۸۶ء میں ایک بین الاقوامی علمی مذاکرے کا اہتمام کیا جس میں دنیا کے مختلف ملکوں کے ارباب علم ودانش جمع ہوئے۔ ڈاکٹر انا میری شمل، ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر سید وحید الدین، ڈاکٹر ایس صلاح الدین، علام دستگیر رشید، عزیز احمد جیسے ارباب کمال نے اقبال کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔

اقبال اکیڈمی نے معیاری تخلیقات بھی شائع کیں جن میں ڈاکٹر عالم خوند میری کی کتاب ''اقبال - کشش اور گریز''، پروفیسر سید سراج الدین کی تصنیف ''مطالعۂ اقبال - چند نئے زاویے'' محترمہ صالحہ الطاف کی تحقیق ''آؤ اقبال سے ملیں'' اہم ہیں۔ یہ تفصیلات ایاز شیخ نے فراہم کیں۔ اُن ہی کی کرم گستری سے فکر اسلامی کا ارتقاء اور علامہ محمد اقبالؒ پر میرے ایک محاضرہ کا انعقاد ممکن ہوسکا جسے یوٹیوب پر براہ راست نشر کیا گیا۔

آج کے توسیعی محاضرہ کے مہمان خصوصی محمد ظہیر الدین صدر اقبال اکیڈمی تھے جبکہ صدارت ضیاء الدین نیر نائب صدر نے کی۔ تعارف کا فریضہ ایاز شیخ نے ادا کیا اور تحسین وتعریف میں مبالغہ آرائی سے کام لیا۔ انھوں نے انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کے ذریعہ علم سیاست اور اسلام کے موضوع پر مجھے تیرہویں شاہ ولی اللہ ایوارڈ سے سرفراز کیے جانے کا بھی ذکر کیا۔ یہ محض اللہ کا کرم اور اس کی نوازش ہے ورنہ اپنوں کی کرم فرمائیوں کا نشانہ میں مستقل بنتا رہا ہوں کیونکہ احباب کو میرا موقف کہیں نہیں بھاتا۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اپنے محاضرہ میں فکر اسلامی کے امتیازی پہلوؤں پر مختصر گفتگو کرنے کے بعد میں نے ہندوستان میں فکر اسلامی کے دو اساطین کا خصوصی تذکرہ کیا۔ شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی (۱۵۶۴-۱۶۲۴ء) اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۰۳-۱۷۶۳ء) ان دونوں اکابر کی علمی وفکری خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ پنجاب کے پیرزادوں سے خطاب کرتے ہوئے علامہ محمد اقبال نے

جو اشعار تخلیق کیے ہیں اُن میں عقیدت بھی ہے اور اثر پذیری کا اعتراف بھی۔

حاضر ہوا میں شیخ مجددؒ کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انور
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار

فکر اقبال کے امتیازات پر گفتگو کرتے ہوئے درج ذیل نکات زیرِ بحث آئے:

۱۔ وطنیت وقومیت کے خلاف معرکہ آرائی
۲۔ مشرق ومغرب سے استفادے پر زور
۳۔ عجمی تصوف پر تنقید
۴۔ الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید
۵۔ عشقِ رسول کی کارفرمائی

مباحثہ مجادلہ میں تبدیل ہونے لگا کیونکہ ایاز شیخ کچھ مضطرب نظر آئے۔ میں نے پُرسکون انداز میں کارروائی چلانے کی درخواست کی۔ وہ میرا مدعا سمجھ گئے اور اختلاف ومخالفت کو خوش دلی سے مرحبا کہنے لگے۔

قحطِ قیادت کا نوحہ

سامعین کی تعداد کم تھی مگر ہوش منداور بیدار مغز تھی، اس کا اندازہ علمی وفکری تعامل کے بعد ہوا۔ جناب سلیم احمد کو تشویش ہوئی۔ فکر اسلامی کے امتیازات کا آج تقریباً فقدان ہے۔ دینی قیادت اسلام کی جو ترجمانی کر رہی ہے اس پر فرقہ واریت کا رنگ غالب ہے، مسلکی اختلافات اور تکفیر وتشدد

کے رجحانات بڑھ رہے ہیں۔ وسعتِ نظر، کشادہ فکری، علمی رواداری کا فقدان ہے غیر مسلموں سے انسانیت نواز تعامل نہیں ہورہا ہے۔علمائے دین اور متولیانِ خانقاہ کو اس زبوں حالی کا احساس بھی نہیں ہے پھر فکرِ اسلامی کا فروغ کیوں کر ہوسکتا ہے؟

بات معقول تھی۔ استدلال منطقی تھا۔صورتِ حال کا ادراک اس مشاہدہ سے جھلک رہا تھا۔ میں نے دارالعلوم دیوبند وقف کے مہتمم مولانا محمد سالم قاسمی (۱۹۲۶ء-۲۰۱۸ء) کے اُس جملہ کا اعادہ کیا جو انھوں نے شعبہ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک پروگرام میں کہا تھی۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ کوئی مسلک قابلِ تقلید ہوسکتا ہے، قابلِ تبلیغ نہیں۔قابلِ تبلیغ صرف اسلام ہے۔علمائے دین اگر اس نکتہ کو سمجھ لیں تو منزل آسان ہوجائے گی۔

حکیم حفیظ کو رہبرانِ قوم سے شکوہ تھا۔انھیں اپنے مفادات حاصلہ سے غرض ہے، ملت کی پستی وادبار سے کوئی سروکار نہیں ہے۔اعلیٰ اقدار و کردار کی شخصیات نایاب ہیں۔مسیحائی کون کرے؟

راقم نے عرض کیا۔ رہبروں پر تنقید کرکے ہم اپنی ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہوسکتے۔ ہر شخص اپنے گھر میں حلقۂ اثر میں رہبر ہے وہ سنجیدگی و فکرمندی کا مظاہرہ کرے۔اصلاح وتعمیر کی منصوبہ بندی کرے، دوسروں کو کوسنے کی جگہ اپنا محاسبہ ومحاکمہ کرے۔آج جیسی ملت ہے ویسے ہی اُس کے رہنما بھی ہیں۔ملت نے ہی انھیں رہنما بنایا ہے۔مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اصلاح وتعمیر کے بارے میں قرآن کا فلسفہ بالکل واضح ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لاَ يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعاً فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ.(المائدہ:۱۰۵)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا اگر تم خود راہِ راست پر ہو۔اللہ کی طرف تم سب کو پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمھیں بتائے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔

آرنلڈ کا اشتراق

سیدغیاث الدین نے آرنلڈ سے اقبال کی محبت وعقیدت پر سوالیہ نشان قائم کیا۔ پتہ نہیں کس جذبے کے عالم میں سر تھامس واکر آرنلڈ (۱۸۶۴۔۱۹۳۰ء) کی شان میں اقبال نے نالۂ فراق جیسی معرکہ آرا نظم لکھ دی؟ کیا وہ استشراق کے استعماری منصوبوں سے ناآشنا تھے؟ اقبال کی یہ فریفتگی باعث خلجان ہے۔ وہ یہاں تک لکھ گئے ہیں۔

تو کہاں ہے اے کلیم ذروۂ سینائے علم
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائی صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم
شور لیلیٰ کو کہ باز آرائشِ سود کند
خاکِ مجنوں را غبارِ خاطر صحرا کند

میں نے عرض کیا کہ اقبال شرق وغرب دونوں سے استفادہ کے وکیل ہیں اور دونوں پر تنقید بھی اُن کی شاعری کا خاص موضوع ہے۔ نالہ فراق میں لاہور سے لندن کی طرف استاد کے سفر کا بیان ہے استاد بھی وہ جو عالم تھا، محقق تھا، مشرقی افکار کا ماہر و متخصص تھا، عقیدت ومحبت کے اِس اظہار میں اقبال نے آرنلڈ کی فکر پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جس سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی۔ اقبالؒ براؤن، آرنلڈ اور دوسرے مستشرقین کے استعماری منصوبوں سے نہ صرف آشنا تھے بلکہ ان کے کھلے ناقد بھی تھے۔

۱۹۳۰ء میں جب آرنلڈ کا انتقال ہوا تو اقبال نے سید نذیر نیازی کے بیان کے مطابق سخت افسوس کا اظہار کیا۔ سر جھکا کے چند لمحے خوب روئے مگر جب آرنلڈ کے مرتبۂ استشراق اور اسلام سے اُن کی عقیدت اور اُن کی کتاب پریچنگ آف اسلام کا تذکرہ کیا تو برجستہ فرمایا:

> دعوتِ اسلام اور اس قسم کی کتابوں پر نہ جاؤ۔ آرنلڈ کی وفاداری صرف خاک انگلستان سے تھی۔ وہی اُن کا دین تھا اور وہی اُن کی دنیا۔ انھوں نے جو کچھ کیا انگلستان کے مفاد کے لیے کیا... آرنلڈ کو مسیحیت سے غرض تھی نہ

> اسلام سے بلکہ سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو آرنلڈ کیا ہر مستشرق کا علم وفضل وہی راستہ اختیار کر لیتا ہے جو مغرب کی ہوسِ استعمار اور شہنشاہیت کے مطابق ہو۔ ان حضرات کو بھی شہنشاہیت پسندوں اور سیاست کاروں کا دست و باز و تصور کرنا چاہیے۔[۱۵]

آرنلڈ کی یہ استعماری ذہنیت خود پریچنگ آف اسلام کے غائرانہ مطالعہ سے ظاہر ہو جاتی ہے۔[۱۶]

اقبال اکیڈمی میں یہ محاضرہ علم وفضل کی کہکشاں کے سامنے ہوا تھا۔ مقصد استفادہ وافادہ سے زیادہ حیدرآباد کے اربابِ علم وذوق کی ہم نشینی تھی جو ایاز شیخ اور رحمٰن پاشا کی محبتوں کے طفیل حاصل ہوئی۔ رحمٰن پاشا صالح طبیعت کے مالک ہیں، علم نواز ہیں۔ سعادت مندی کا حصۂ وافر پایا ہے، کامرس میں ماسٹرز کی تکمیل کی ہے، کئی سالوں سے علمی رابطہ استوار کر رکھا ہے۔ میری تحریروں کو خاطر میں لاتے ہیں اور میری کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔ پروفیسر محسن عثمانی سے کمال درجہ کی عقیدت رکھتے ہیں اور اُن کی ہر تحریر مطالعہ کے لیے مجھے بھیجتے ہیں۔ انھوں نے پروگرام کے اختتام پر رہائش گاہ تک رفاقت نبھائی اور تحائف کے ساتھ دل موہنے کا سلیقہ تو انھیں اچھی طرح آتا ہے۔

انسانیت نوازی کے تجربے

دوسرا سفر ۲۴ رجون ۲۰۱۹ء کو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کا ہوا اور اپنے جلو میں انسانیت اور یکجہتی وسالمیت کے انوکھے تجربات لے کے آیا۔ میں ایرانڈیا کی پرواز سے دوپہر ساڑھے بارہ بجے راجیو گاندھی طیران گاہ پر پہنچا تو رجسٹرار نے مجھے مشورہ دیا کہ پرائیویٹ ٹیکسی لے کر یونیورسٹی پہنچ جاؤں۔ خوش قسمتی سے ڈرائیور مسلمان نکلا۔ اس نے سلام وکلام سے میری اجنبیت قدرے دور کر دی۔ راستے بھر سیاسی جماعتوں سے شکوے سناتا رہا، مجلس اتحاد المسلمین کے سربراہوں سے زیادہ خفا محسوس ہوتا تھا۔ خدا خدا کر کے جامعہ عثمانیہ پہنچا تو اُس نے آٹھ سو اسّی روپے کا بل تھمایا۔

اگلے دن علی الصباح واپسی تھی۔ مجھے پانچ بجے صبح اولا کیب بک کر کے طیران گاہ پہنچنا تھا۔ اب جس ڈرائیور سے واسطہ پڑا وہ ہندو تھا۔ آرٹس میں گریجویٹ۔ انگریزی اور تیلگو کے علاوہ دوسری

زبانوں سے ناواقف۔ ٹیکسی میں بیٹھا تو ہلکی موسیقی کے ساتھ بھجن ریکارڈنگ پر لگا تھا۔

سائیں نمو، گروسائیں نمو

جب کچھ راہ ورسم کی صورت پیدا ہوئی تو میں نے تیلگو بھجن کے اس جملے کا مطلب پوچھا۔ اس نے مسکرا کے جواب دیا کہ میں گاڈ کو نمسکار کرتا ہوں۔ پھر بتایا کہ تلنگانہ کے تمام مندروں میں دوڈھائی گھنٹے صبح بھجن کا معمول ہے۔ تھوڑی دیر بعد بولا: سر، ایسا سمجھئے کہ آپ لوگ جیسے اذان دیتے ہیں۔ یہ ڈرائیور بھی باتونی تھا مگر اُس کی باتیں حکومت کی تعلیمی پالیسی پر تھیں۔ حیدرآباد میں انجینئرنگ کی بڑھی ہوئی مانگ، اِس مانگ کی وجہ سے تعلیم کی تجارت، اور ڈگری ہولڈرز کی بے روزگاری، انجینئرنگ کے علاوہ دوسرے علوم وفنون کی بازار میں قدر اور ضرورت، ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کی تعلیم کے اخراجات جو والدین کے لیے کمر توڑ ثابت ہورہے ہیں۔ میں ہکا بکا اس کی معلومات اور اعداد وشمار کی تفصیلات سنتا رہا۔ یقین ہوگیا کہ اس کی ڈگری اور معلومات میری جیب کے لیے زیادہ گراں ہوں گی۔ مسلمان ڈرائیور کے سلام کلام کا خمیازہ بھگت چکا تھا۔ دوستوں نے بتایا کہ طیران گاہ سے عثمانیہ یونیورسٹی کا کرایہ پانچ چھے سو روپے سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ٹیکسی سے اترتے وقت میں نے کرایہ دبے لفظوں میں جاننا چاہا تو اس نے موبائل اسکرین روشن کردی۔ کل چھے سو بارہ روپے واجب الادا تھے میں نے چھے سو بیس روپے ادا کیے۔ اُس نے لجاجت سے ریزگاری نہ ہونے کا شکوہ کیا۔ مسکراہٹ میرے لبوں پہ آگئی۔ جی چاہا کہ اُس کی پیشانی چوم لوں۔

دو ڈرائیوروں کے اس تعامل نے مجھے فکر مند بنادیا۔ ایک ہم مذہب تھا، چہرے پر خشخشی داڑھی تھی۔ اردو میں ہم کلام تھا مگر آٹھ سو اسّی روپے ادا کیے۔ دوسرا ہندو تھا بھجن سننے کا عادی تھا۔ تعلیم یافتہ تھا۔ قومی تعلیمی پالیسی سے واقف ہی نہیں اس کا ناقد تھا۔ شائستہ ومہذب تھا۔ اُس نے اُسی مسافت کے چھے سو بارہ روپے کا بل پیش کیا۔ ایک کے پاس سیاسی جماعتوں سے شکایتوں کا انبار تھا دوسرے کے پاس قومی تعلیمی پالیسی کا بھرپور تجزیہ تھا۔ کتنا فرق تھا دونوں میں۔ یہ دو قوموں کی نمائندگی تھی۔ ایک روبہ زوال تھی تو دوسری عروج کی جانب رواں دواں۔

فرق تا بہ قدیم ایں کجاست تا بہ کجا

عثمانیہ یونیورسٹی کے رجسٹرار آفس میں مختلف مضامین اور علوم وفنون کے اساتذہ سے ملاقات ہوئی۔ دو کے سوا سب غیر مسلم تھے مگر اُن کا رویہ منصفانہ تھا۔ ڈاکٹر شیلندر لینڈی، پروفیسر اور

صدر شعبہ مراٹھی آرٹی ایم ناگپور یونیورسٹی نے دوستی اور ہمدردی کی مثال قائم کی۔ کھانے کی میز پر رجسٹرار کے دفتر میں فارغ اوقات میں ہرجگہ مسیحائی کرتے رہے۔ روانگی کے وقت ٹیکسی انھوں نے بُک کرائی۔ عشائیہ میں حیدرآباد کی مشہور بریانی کا اہتمام انھوں نے کرایا، خود بھی لطف اندوز ہوئے۔ علی گڑھ تک کے سفر میں وقفہ وقفہ سے حال احوال دریافت کرتے رہے۔ مسلم یونیورسٹی کی تابندہ روایات کا تذکرہ کرتے رہے۔ ماڈرن انڈین لنگویجز شعبہ کے مراٹھی سیکشن کے اساتذہ کی خیریت دریافت کرتے رہے اور چلتے چلتے پٹھان کو سلام عقیدت پہنچانے کی درخواست کرڈالی۔ اُن کی تہذیب وشرافت دل پر نقش کرگئی۔ عہدِ رسالت میں ایسے ہی روادار اور انسانیت نواز افراد رہے ہوں گے جن کے بارے میں قرآن نے اعلان کیا:

لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ. (الممتحنہ:۸)

اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم اُن لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمھیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اسی سورہ کی اگلی آیت میں دین کے دشمنوں سے دوستی کرنے کو ظلم قرار دیا گیا ہے اور ایسے دین دشمن عناصر سے دوستی گانٹھنے والوں کو ظالم کا خطاب دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو اس آیت کے اسرار ومضمرات کو سمجھنے اور ان کی روشنی میں دعوت واقامت کی منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت ہے۔ سارے غیر مسلم افراد کو دشمن تصور کرلینا اور اس کے مطابق دعوت مزاحمت کا ایجنڈا تیار کرنا قرآن کی تعلیمات کے منافی ہے اور فراست وتدبر سے متصادم بھی۔

تحقیق میں سرقہ کا طاعون

طیران گاہ ڈیڑھ گھنٹہ قبل پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر دم لینے کے بعد رفع حاجات سے فراغت ہوئی

اور بنک کاؤنٹر کے ضروری امور کو نمٹایا تو آج کا اخبار پڑھنے کی ضرورت محسوس کی۔ ٹائمس آف انڈیا کی شہ سرخی نے ذہن کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی مقالات سرقہ اور نقالی کے امتحان میں ناکام!

ہر مقالۂ تحقیق میں چالیس فیصد مواد مشابہ اور یکساں۔

پچھلے دس سالوں میں تفویض کردہ پی ایچ ڈی کے مقالات کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے نظرثانی کے قابل قرار دیا۔

اخبار کی یہ سرخیاں چونکا دینے والی تھیں۔ ہر مضمون کے ریسرچ اسکالرز کو تنبیہ کی گئی کہ وہ ان مجلّات و جرائد کو ہی پڑھیں جن کا اندراج یو جی سی کیرلسٹ میں موجود ہے تاکہ مستند معلومات اور تجزیے اُن تک پہنچ سکیں۔ تحقیق و تفتیش کا یہ عمل عثمانیہ یونیورسٹی تک محدود نہیں، ملک کی تمام جامعات اور علمی و تحقیقی معاہد اس کی زد میں ہیں۔ مئی ۲۰۱۹ء میں یو جی سی نے اعلان عام کیا ہے کہ تمام جامعات میں جمع کردہ پچھلے دس سالہ تحقیقی مقالات کی تفتیش ہوگی۔ ان میں سرقہ اور نقالی کی جانچ ہوگی۔ اس مقصد کے لیے اس نے اگلے چھ مہینوں میں کسی علمی پروجیکٹ اور مطالعاتی منصوبہ کی سفارش کی ہے۔

یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے تحقیق کے معیار کو بحال کرنے کے لیے اور سرقہ ونقالی کی غیر اخلاقی وغیر قانونی حرکتوں سے طلبہ کو بچانے کی خاطر سفارش کی ہے کہ ریسرچ اسکالر اپنی تخلیقات کی تعداد میں اضافہ کے لیے سمجھوتہ نہ کریں۔ غیر معیاری جرائد میں اپنے مضامین شائع نہ کرائیں۔ یو جی سی نے اس مقصد کے حصول کے لیے ایک نظام کار وضع کیا ہے:

Consortium for academic and research ethics

اس کا مخفف CARE ہے۔ یو جی سی کو احساس ہے کہ ہندوستان میں نقد ادائیگی کے صلہ میں مقالات کی منظوری واشاعت کا کلچر عام ہو رہا ہے۔ تحقیق کو تجارت بنا دیا گیا ہے۔

جولائی ۲۰۱۸ء سے عثمانیہ یونیورسٹی نے سرقہ کو چیک کرنے کا نظام کار بنایا۔ سال گزشتہ نوسو مقالات کو اس عمل سے گزارا گیا تو معلوم ہوا کہ دوسو مقالات تحقیق میں ۴۰ سے ۴۵ فیصد لوازمہ سرقہ کی زد میں آتا ہے اور بعض معاملات میں تو یکسانیت اور مشابہت کا مواد ۷۵ سے ۹۰ فیصد تک پایا گیا ہے۔ اس کے وجوہ واسباب کا پتہ لگانے کی کوشش بھی اخبار نے کی۔

پروفیسر ڈی رویندر پرنسپل آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی کہتے ہیں کہ اس یونیورسٹی میں تحقیق کے طلبہ تیلگو ذریعہ تعلیم سے گریجویشن مکمل کرکے آتے ہیں۔ انگریزی میں عملِ تحقیق کی تکمیل اُن کے لیے بڑا چیلنج ہے۔ مجبور ہوکر وہ نقل اور سرقہ میں لگ جاتے ہیں۔ اگر تیلگو اور اردو میں مقالہ لکھنے کی رعایت مل جائے تو بڑی حد تک سرقہ کا سدباب ہوسکتا ہے۔

شیخ الجامعہ عثمانیہ یونیورسٹی ایس راما چندرم اس صورت حال کا ذمہ دار طلبہ واساتذہ کے درمیان تعلقات کو قرار دیتے ہیں۔ اگر سپروائزر محنت اور توجہ سے کام لیں تو سرقہ میں کمی آسکتی ہے۔ انھوں نے اس معاملہ کی تحقیق اور اصلاحِ حال کے لیے ایک کمیٹی کی تشکیل کا اعلان کیا۔

پربھاکر جیوتی ایک ریسرچ اسکالر کا الزام ہے کہ ہم حوالوں کی غرض سے مطبوعہ مواد نقل کرتے ہیں مگر صحیح اور مناسب منہاجیات سے ہمیں آگاہ نہیں کرایا جاتا۔ آر این شنکر، ایک دوسرے ریسرچ اسکالر کا بیان ہے کہ یونیورسٹی میں اساتذہ کی اسامیاں خالی پڑی ہیں، اساتذہ مقرر کردہ تعداد سے زیادہ طلبہ کو ریسرچ کراتے ہیں اور انھیں ضروری رہنمائی فراہم کرپاتے ہیں نہ اُن کے پاس اتنا وافر وقت ہوتا ہے۔

اپنی اننگ کھیل چکے پی ایل پشوپیشر راؤ، آرٹس کالج کے سابق ڈین یونیورسٹی گرانٹس کمیشن پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ یو جی سی کے اس عمل کو بے سود بتاتے ہیں۔ اُسے تو سخت قانون بنانا چاہیے اور سپروائزر کو بھی قانون کے حصار میں لانا چاہیے۔ [۱۷]

اگر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں جانچ اور احتساب کا یہ عمل شروع ہوجائے تو علم وتحقیق کے بڑے سورما بھی اس شعر کا مصداق قرار پائیں گے:

بڑا شوق سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

اور فارسی مصرع نقل کروتو بدتہذیبی کا مجرم ٹھہرایا جاؤں:

چوں دُم برداشتم مادہ برآمد

جو قومیں احتساب اور محاکمہ کا عمل محبوب رکھتی ہیں وہی ترقی وکامرانی کی راہ پر گامزن ہوتی ہے۔اقبال نے بجا کہا ہے:

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

حواشی وتعلیقات

۱۔ روزنامہ انقلاب (نئی دہلی) ۱۳/اپریل ۲۰۱۹ء

۲۔ روزنامہ انقلاب (نئی دہلی) ۱۴/اپریل ۲۰۱۹ء

۳۔ القرضاوی یوسف الصحوة الاسلامية بين الجحود والتطرف اردو ترجمہ: سلمان ندوی، اسلامی پہلوؤں، انکار اور انتہا پسندی کے نرغے میں، مرکزی مکتبہ اسلامی (دہلی) ۱۹۸۲ء، ص: ۱۹-۱۱

۴۔ مشہور محقق محمود شاکر کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے۔شیخ القرضاوی کہتے ہیں کہ حدیث میں قبلکم کے جوالفاظ آئے ہیں اس سے مراد پچھلے مذاہب کے پیرو ہیں۔ خاص طور سے نصاری کو خطاب کیا گیا ہے جن کے بارے میں قرآن نے بھی صراحت کی ہے:

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لاَ تَغْلُواْ فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلاَ تَتَّبِعُواْ أَهْوَاء قَوْمٍ قَدْ ضَلُّواْ مِن قَبْلُ وَأَضَلُّواْ كَثِيراً وَضَلُّواْ عَن سَوَاء السَّبِيلِ. (المائدہ:۷۷)

کہو اے اہل کتاب، اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور اُن لوگوں کے تخیلات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سَوَاء السَّبِيل سے ٹھگ گئے۔

شیخ القرضاوی کہتے ہیں کہ اس حدیث کے پس منظر کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ انتہا پسندی اور غلو کا آغاز چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ہوتا ہے پھر اس کا دائرہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے مذکور آیت کی تفسیر میں أَهْوَاء قَوْمٍ سے مراد بدعات کو لیا ہے

کیوں کہ ہر بدعت خواہش نفس ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان جب کسی خواہش کو دین بنانا چاہتا ہے تو اس کے لیے کوئی علامت ایجاد کرتا ہے۔ یہاں اشارہ سینٹ پال اور اس کے ساتھیوں کی طرف ہے جنھوں نے نصرانیت کا حلیہ بگاڑا اور بُت پرست قوموں کی نقالی میں تثلیث کا ڈھونگ رچایا۔ دیکھیے تدبرِ قرآن، انجمن خدام القرآن (لاہور) جلد دوم، ستمبر ۱۹۷۶ء، ص: ۳۴۱

۵۔ القشیری، مسلم بن الحجاج، الجامع الصحیح، کتاب العلم، باب ھلک المتنطِعون، حدیث: ۲۶۷۰

۶۔ فلاحی، عبیداللہ فہد، فکر اسلامی اور اس کے امتیازات، سہ ماہی فکر و نظر، اسلام آباد، جلد ۵۴، عدد ۳/ مارچ ۲۰۱۷ء

۷۔ مجموعہ مقالات علمیہ در بارۂ ایک مجلس کی تین طلاق (روداد علمی مذاکرہ ۶-۴/نومبر ۱۹۷۳ء) نعمانی کتب خانہ (لاہور) ۱۹۷۹ء ہندوستان میں اسلامک ریسرچ سنٹر (احمد آباد) نے ۱۹۷۴ء میں پہلی بار اسے شائع کیا تھا۔ پاکستان کے ناشر مولانا محمد عطاء اللہ بھوجیانی امیر جمعیت اہل حدیث لاہور نے اس روداد کی طبع ثانی کے وقت مولانا پیر محمد کرم شاہ ازہری کا ایک فکر انگیز مقالہ 'دعوت فکر و نظر' بھی اس کے ساتھ بطور ضمیمہ منسلک کر دیا۔ ص: ۱۱-۱۰

۸۔ دعوت فکر و نظر، حوالہ بالا، ص: ۲۴۲

۹۔ روزنامہ انقلاب (نئی دہلی) مسجد میں خواتین کے داخل ہونے کی ممانعت نہیں ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، ۱۲/اپریل ۲۰۱۹ء، یہ مضمون دو قسطوں میں شائع ہوا۔

۱۰۔ نفسِ مصدر، فاضل مصنف آخر میں نتیجہ نکالتے ہیں کہ ''نہ یہ درست ہے کہ خواتین کو مسجد جانے کی ترغیب دی جائے اور ہر مسجد میں اُن کے لیے نماز کا انتظام ہو اور نہ یہ درست ہے کہ جہاں مسجدوں میں خواتین کے لیے نماز کا انتظام کی ضرورت ہے وہاں بھی اس ضرورت کو نظر انداز کر دیا جائے۔

۱۱۔ بورڈ آف اسٹڈیز کی اس نشست میں ایم۔اے میں جن دوسرے کورسز کی شمولیت کی تجویز منظور ہوئی وہ اس طرح ہیں: تکثیریت اور اسلام، تاریخ سیرت نگاری، قرآن کریم کے انگریزی تراجم، فقہ الاقلیات، مقالہ شریعت علوم اسلامی میں ہندوؤں کی خدمات وغیرہ۔

۱۲۔ The Hindu, July 25, 2018, Ban on entry of women in Sabrimala is patriarchal: Supreme court.

۱۳۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: انقلاب، ۲۶/جولائی ۲۰۱۸ء (ممتاز عالم رضوی کی رپورٹ: مسجدوں میں خواتین کے داخلے پر پابندی نہیں)

۱۴۔ The Hindu, July 8, 2016. Hoping that the move will set a president the

imam said: at least on Eid special arrangement should be made for women to offer namaz at Eidgah in the country.

اس خبر پر مثبت ردِعمل اور خواتین کی مسجد میں حاضری کے شرعی مسئلہ کی وضاحت کے لیے دیکھیے: فلاحی عبیداللہ فہد، فکر اسلامی کے حجابات، منشورات (نئی دہلی) جنوری ۲۰۱۸ء، ص ۱۲۵-۱۱۷، ۱۹۴-۱۹۳

۱۵۔ نیازی سید نذیر مکتوبات اقبال، اقبال اکیڈمی (کراچی) ۱۹۵۷ء، ص: ۹۷-۹۶

۱۶۔ آرنلڈ کی استشراقی واستعماری فکر کے مطالعہ کے لیے دیکھیے: فلاحی عبیداللہ فہد، یہودی مغرب اور مسلمان، اسلامک بک فاؤنڈیشن (نئی دہلی) ۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء، ص ۱۵۶-۸۹

۱۷۔ The Times of India, June 52, 2019 (Ph.D dissertations fail plagiarism test in OU.

مذہبی تصورات کا مبداء کیا ہے؟

سید محمد کاظم نقوی

■■■

سید محمد کاظم نقوی *

مذہبی تصورات کا مبداء کیا ہے؟

عام طور سے اس طرح کے سوال کرنے والے مادہ پرست اور منکرین خدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے مذہب اور خدا کے عقیدے کا سرچشمہ علم الاجتماع (Sociology) اور علم النفس (Psychology) کے بعض محرکات کو قرار دیا ہے۔

مادہ پرست اس سوال کا جواب جو کچھ دیں لیکن ہمارے نزدیک خدا اور دوسرے ماوراء طبیعی امور کی طرف انسان کو خود اس کی فطرت نے متوجہ کیا ہے۔

یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے ہم دریافت کریں کہ انسان کس لیے مل جل کر زندگی بسر کرتا ہے؟ وہ دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کو کیوں پسند نہیں کرتا؟ یا انسان میں جذبۂ حُبِ ذات کب سے پیدا ہوا ہے؟ کس زمانے سے اس میں جنسی خواہشیں پیدا ہوئیں اور وہ شریکِ زندگی کی تلاش میں رہنے لگا؟ کب اس کے دل میں اولاد کی محبت نے جگہ پائی اور وہ اسے اپنے جگر کا ٹکڑا سمجھنے لگا؟ ان تمام سوالات کا ایک اور صرف ایک جواب ہے کہ ان امور کا سرچشمہ انسانی فطرت ہے۔ یہ میلانات انسان کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ اسی لیے جب سے انسان ہے وہ ان چیزوں کی طرف مختلف صورتوں میں

* سابق پروفیسر، شعبۂ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

متوجہ رہا ہے۔

اس کے علاوہ خداوند عالم کی ذات کی طرف متوجہ ہونے کا ایک دوسرا قوی سبب بھی ہے جس کا اثر کسی طرح فطری سبب سے کم نہیں۔ یہ انسان کی عقل وفکر ہے۔ انسان نے یہ دیکھ کر کہ کوئی چیز بغیر علت کے وجود میں نہیں آتی ہے، تھوڑے سے غور وخوض کے بعد طے کیا کہ خود اس کے وجود کے لیے، اس کے علاوہ کائنات عالم کے اس حیرت انگیز نظم وضبط کے واسطے جو ہر صاحبِ فہم کے سامنے ہے کوئی نہ کوئی سبب ہونا چاہیے۔ اس نے اسی کا نام خدا رکھ لیا۔

دوسرے زیادہ واضح الفاظ میں یوں کہا جائے کہ وہی جذبہ کہ جس کی تحریک سے انسان نے زندگی اور نیچر کے مختلف مظاہر کے بارے میں غور کیا، وہی جذبہ جس نے اسے آمادہ کیا کہ وہ مادے کے پیچیدہ اسرار، کائنات کے مستقبل اور متغیر قوانین کو معلوم کرنے کی کوشش کرے، وہی جذبہ کہ جس نے علم ودانش کے شیدائیوں کو ابھارا کہ وہ عالم طبیعت کے حقائق کا پتہ چلانے کی خاطر زندگی اور اس کی لذتوں سے آنکھیں بند کرلیں اور اپنی عمر علمی مرکزوں اور صنعتی تجربہ گاہوں میں گزار دیں، اسی پر اسرار جذبہ انسانی نے انسان سے کہا کہ وجود کے سرچشمہ کا پتہ چلانے کی کوشش کرے۔

جہالت اور نادانی سے مقابلہ، حقائق عالم کے جاننے کے لیے کدوکاوش، جو چیزیں انسان کے علم ودانش کی دست رس سے باہر ہیں انھیں معلوم کرنے کی آرزو انسان کے فطری گہرے احساسات میں شامل ہے۔ انسان بہرصورت فطرت کے اس مطالبہ کو پورا کرنے کے لیے تقریباً اپنے کو مجبور پاتا ہے۔

قدیم تاریخ کے مطالعے، انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تغیرات کی تحقیق، انسانی علم ودانش کے ارتقاء کے اسباب معلوم کرنے کی کوشش سے پتہ چلتا ہے کہ انسان کی فطرت میں جذبۂ تلاش حق رچا بسا ہوا ہے۔ ہم اس کے منکر نہیں ہیں کہ اکثر وبیشتر علمی کاوشوں کے پس منظر میں ان مادی اور دنیوی فوائد کا حاصل کرنا مقصود تھا جو ان کی وجہ سے افراد یا اقوام کو پہنچنے والے تھے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان تمام تحقیقات کا اصل منبع انسان کا فطری جذبۂ تلاش تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ہستی کے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے ہاتھوں سے چھووے۔

تاریخ علم وصنعت بتارہی ہے کہ انسان کا یہ فطری جذبہ تحقیق جنوں کی حد تک پہنچ گیا۔ اس

نے انسان کو ایسی خطرناک آزمائشوں پر آمادہ کردیا جن میں ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ وہ چاروں طرف سے خطروں میں گھر گیا لیکن اس کے قدم کبھی رکے نہیں۔ وہ برابر آگے بڑھتا رہا۔ اس نے اس راہ میں غیر معمولی قربانیاں پیش کیں۔

اگرچہ بچے عقل وفہم کے لحاظ سے پختہ اور کامل نہیں ہوتے لیکن انسان کے اس فطری جذبے کے اثرات کا بڑے واضح طور سے ان کی زندگی میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

بچہ گویا سوال اور جستجو کا ایک خوبصورت مجسمہ ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے ماں باپ اور استاذ سے مختلف چیزوں کے متعلق پوچھا کرتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ مطلب یہ ہے کہ بچہ اس سطحی اور معمولی ادراک پر ہرگز اکتفا نہیں کرتا ہے جو کسی آواز کے سننے یا کسی چیز کے دیکھنے کے بعد اس کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ بچے کے پے درپے اور غیر منظّم سوالات بتاتے ہیں کہ اس کی فطرت میں علم کی پیاس ہے۔ وہ جہالت اور ناواقفیت کو دور کر کے علم ودانش سے سیراب ہونا چاہتا ہے۔

تہذیب کے بالکل ابتدائی زمانے میں بھی انسان ہرگز ہمارے زمانے کے چھ سات برس کے بچے سے عقل وفہم کے لحاظ سے کم نہ تھا۔ کیا وہ ان چیزوں کے بارے میں جو اس کی آنکھوں کے سامنے تھیں اپنے دل میں پوچھتا نہ ہوگا کہ ان کے اسباب کیا ہیں؟

وہ دیکھتا تھا کہ کسی درخت سے پتے کا گرنا، کسی ٹہنی کا دفعتاً ٹوٹ جانا ہوا کے تیز وتند جھونکے کے چلنے کا نتیجہ ہے۔ اسے نظر آتا تھا کہ جو مکان ابھی ابھی صحیح وسالم اس کی آنکھوں کے سامنے موجود تھا موسلا دھار بارش کی وجہ سے مسمار ہو گیا۔ ایسے ہی سیکڑوں واقعات دیکھنے کے بعد وہ ایک علمی اور فلسفیانہ نظریے کا معتقد ہو گیا کہ کوئی حادثہ، کوئی واقعہ اس عالم کائنات میں بے سبب اور بے علت نہیں ہوتا ہے۔ اس کو نظر میں رکھتے ہوئے یقیناً یہ ناگزیر ہے کہ اسے اس دنیا کے خالق کی فکر پیدا ہو جو وجود کا سرچشمہ ہے، جس کی قدرت کے اشارے سے یہ ساری کائنات پیدا ہوئی ہو۔

علوم وفنون کی تاریخ میں اب تک سیکڑوں مفروضات یکے بعد دیگرے دنیا کے سامنے آتے رہے ہیں، لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد وہ غلط ثابت ہوئے اور ان کی جگہ دوسرے مفروضات نے لے لی۔ یہ مسلّم ہے کہ ان صحیح یا غلط علمی فارمولوں کی طرف انسان کی توجہ کا اصل سبب اس کا حقیقت طلبی کا جذبہ تھا۔ کوئی عالم اور سائنس دان ان علمی نظریات کی پیدائش کو عقلی اور فکری سبب کے علاوہ کسی دوسری چیز کا نتیجہ

نہیں قرار دیتا ہے۔

اگر ہم سب متفقہ طور سے علمی نظریات کی پیدائش کو اجتماعی اور نفسیاتی مخصوص اسباب کا نتیجہ نہیں سمجھتے تو کیوں اور کس لیے مبداء وجود اور خالق عالم کے تصور کے پیدا ہونے کے بارے میں ایسا سمجھتے ہیں؟

نفسیاتی یا اجتماعی علل واسباب کی احتیاج ان چیزوں کو ہے جن کی کوئی فطری علت اور فکری سبب نہ ہو۔ ایسی صورت میں علم الاجتماع یا علم النفس کو حق حاصل ہے کہ وہ اس خلا کو بھرنے کے لیے اظہار خیال کرے۔ مثلاً بعض بیہودہ خیالات کی پیدائش جن کا کوئی فطری یا عقلی سبب موجود نہیں ہے انھیں ان علوم وفنون کا موضوع فکر بننا چاہیے۔ کچھ لوگ بعض جانوروں کو مبارک اور بعض کو منحوس سمجھتے ہیں۔ بے شک یہ ایسا عقیدہ ہے کہ جس کا سرچشمہ علم النفس اور علم الاجتماع کو معلوم کرنا چاہیے، لیکن ایسے مسائل کو جو انسان کے باطن کا مطالبہ، اس کی خلقت کا تقاضا، اس کی فطرت کی صدا اور اس کے علاوہ عقلی اور فکری محرکات کا نتیجہ ہیں وہ علم الاجتماع اور علم النفس کے دائرۂ حکومت سے باہر ہیں۔ ان کے متعلق ان علوم کو اظہار خیال کا ہرگز حق نہیں ہے۔

چوں کہ مادہ پرست طبقہ خدا اور دوسرے مذہبی امور کے بارے میں غور نہیں کرنا چاہتا، وہ اپنے کو ان کی گرفت سے بچانا چاہتا ہے اس لیے ان کے مقتضائے فطرت ہونے کا انکار کرتے ہوئے ان کے دوسرے اسباب و وجوہ تراشتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں علم الاجتماع اور علم النفس سے مدد لیتا ہے۔ اتفاق سے یہ طبقہ مذہب کی پیدائش کی توجیہ اور تفسیر کے بارے میں اتفاق نہیں رکھتا بلکہ مختلف لوگ اس کے گونا گوں دوسرے مختلف اسباب وعلل بیان کرتے ہیں۔

کیا مذہب کا سرچشمہ خوف ہے؟

مثلاً نفسیات کے مشہور ماہر ''فرویئڈ'' کے نزدیک مذہب کو نیچر کی بے رحم طاقتوں سے انسان کا خوف وہراس وجود میں لایا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے:

> ''خلق کائنات کے متعلق ہمارے مذہبی عقیدے کا تعلق ہمارے بچپنے کی زندگی سے ہے، بچہ اپنے کو ایک عظیم جہاں کے سامنے عاجز اور بے سہارا

محسوس کرتا ہے، تمام ان مبہم خطروں کے مقابلہ کے لیے جو دنیا میں بچہ کو دھمکاتے ہیں ماں اپنے بچہ کی پہلی حامی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر طرح کے اضطراب کے عالم میں اس کی مددگار رہے۔ بہت جلد باپ ماں کی جگہ آجاتا ہے۔ تمام دور طفولیت میں یہ فریضہ باپ کے ذمہ رہتا ہے کہ بچپنے کا ڈر بالغ ہونے کے بعد بھی برقرار رہتا ہے۔ بالغ انسان ان تمام خطرات سے آشنا ہوتا ہے جن سے اسے ہلاکت کا اندیشہ ہوتا ہے۔ وہ بچہ کے مانند دنیا کے مقابل ضعیف ہے۔ وہ جس طرح بچپن میں باپ کے پہلو میں پناہ لیتا ہے اسی طرح زندگی کی دوسری منزلوں میں کوئی محافظ اور پشت پناہ چاہتا ہے۔ بنابریں وہی باپ جو بچپن میں اس کے نزدیک بے انتہا طاقت کا مالک تھا بعد میں الوہیت کا تصور بن جاتا ہے جو مافوق البشر ہے۔''
(فرویڈ اور فرویڈازم، ص: ۱۴۸)

اس دور کا ایک مؤرخ مذہبی عقائد کے پیدا ہونے کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''خوف دیوتاؤں کو جنم دیتا ہے۔ خوف کی فہرست میں موت سے ڈر کا درجہ سب سے اہم ہے۔ انسان حیات کے ابتدائی دور میں ہزاروں خطرات کے درمیان تھا اور بہت کم اتفاق ہوتا تھا کہ کوئی شخص اپنی طبیعی موت سے مرے۔ چونکہ لوگ بڑھاپے تک پہنچنے سے پہلے دوسروں کے جارحانہ حملوں کے نتیجہ میں یا مہلک بیماریوں کی وجہ سے دنیا سے چلے جاتے تھے، اسی بنا پر ابتدائی انسان یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ موت ایک طبیعی حادثہ ہے۔ اسی دلیل سے وہ ہمیشہ اس کے لیے مافوق الطبیعت علت تصور کرتا تھا۔

موت سے خوف، اتفاقی حوادث جن کی علت کا انسان پتہ نہیں چلا سکتا۔ ان پر حیرت و تعجب، دیوتاؤں کی امداد کی امید اور ان خوش بختیوں پر جو انسان کو حاصل ہیں شکرگزاری یہ تمام امور اعتقادات دینی کے اسباب

ہیں۔'' (تاریخ ایل ڈورنیٹ، ج:۱،ص:۸۹-۹۰)

یہ سب ایک طرف اور بیسویں صدی کے عظیم المرتبت فلسفی اور رہنما برٹرنڈ رسل دوسری طرف جن کے اسم گرامی سے علمیت اور عظمت جھلکتی ہے۔انھوں نے گویا فیصلہ کن بات کہہ دی ہے:

''میں سوچتا ہوں کہ خدا اور دوسرے مذہبی امور کے عقیدے کی علت خوف ہے۔ چوں کہ انسان ایک حد تک اپنے کو ناتواں دیکھتا ہے۔تین چیزیں ہیں جو اس کے لیے موجبات خوف فراہم کرتی ہیں۔ان میں سے ایک نیچر ہے جو صاعقہ کے ذریعہ اس کے سر پر ضرب لگاتی ہے یا زلزلے کے ذریعہ اسے نگل لیتی ہے۔ دوسری چیز خود انسان ہے جو جنگ کے وسیلے سے اپنے بنی نوع افراد کو تلف کرسکتا ہے۔تیسری چیز کا تعلق بہت زیادہ مذہب سے ہے۔انسان کی شدید جنسی خواہشیں بھی اسے نقصان پہنچا سکتی ہیں۔انسان زندگی کے سکون واطمینان کے لحظات میں اپنی بعض حرکتوں پر پشیمان ہوتا ہے۔مذہب اس کا موجب بنتا ہے کہ انسان کے خوف و وحشت میں کچھ توازن واعتدال پیدا ہو۔'' (توضیح دیرسی مصاحبہ برٹرنڈ رسل، روایت ص:۱۲۱)

ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان حوادث عالم کے مقابلہ میں نہتا، بیچارہ اور کمزور ہے اس لیے وہ ان سے غیر معمولی طور سے خائف رہا ہے۔اسی خوف نے وجود خدا کا عقیدہ پیدا کیا ہے۔

انسان مہلک بیماریوں کا علاج نہیں کرسکتا تھا۔وہ ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا کہ نیچر کے بے رحم اور سنگ دل ہاتھ افراد انسانی کو گروہ در گروہ ہلاک کررہے ہیں۔وہ ان خوف ناک حوادث کے مقابلہ میں نفسیاتی اضطراب کی وجہ سے مجبور تھا کہ کسی مبہم اور پراسرار ہستی کو اپنی پناہ گاہ قرار دے جو اس کے دہلتے ہوئے قلب کو سکون اور اطمینان عطا کرے۔

اس کے علاوہ زمان بلوغ اور اس کے بعد ایک منزل تک انسان کی زندگی سہارا طلب تھی۔ اس نے ہمیشہ اس زمانے میں اپنے کو ایک طاقت ور شخص کی پناہ میں دیا۔اس نے اسے بہت سے خطرات سے بچایا۔اس دور کی زندگی نے اس کے دماغ میں یہ خیال پیدا کیا کہ وہ نیچر کی مہلک طاقتوں

کے مقابلہ کے لیے ایک قابل اطمینان پناہ گاہ پیدا کرے۔ ایک وقت گزرنے کے بعد یہی پناہ گاہ خدا کے تصور اور عقیدے کی شکل میں نمودار ہوگئی ہے۔

یہ نظریہ کس حد تک صحیح ہے؟

مذاہب وادیان کی تاریخ مدوّن ہوچکی ہے۔ اسے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خیال مذہبی طبقہ پر ایک بہت بڑی تہمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس نظریہ کا اظہار کرنے والوں نے بڑی سنجیدگی اور متانت سے علمی لب ولہجہ میں اسے بیان کیا ہے۔ خداپرستوں کی طرف یہ تیر علم النفس کے ترکش سے سر کیے گئے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ان کا یہ خیال ایک بے دلیل دعویٰ ہے۔ کوئی چھوٹی سی بھی دلیل وہ اس پر قائم نہیں کرسکا ہے۔ پہلے عرض کیا گیا کہ علم النفس اور علم الاجتماع یا ان کے مانند دوسرے علوم کی مدد سے ایسے مسائل کے متعلق اظہار خیال کرنا محل نظر ہے جس کا کوئی داخلی، فطری اور عقلی سبب موجود نہ ہو۔ اس صورت میں بے شک بجا اور بامحل ہے کہ ان علوم کے ماہرین ان مسائل کے بارے میں کوئی نظریہ قائم کریں اور ان کا نفسیاتی سبب نیچر کی بے رحم طاقتوں سے ڈر یا زمان طفولیت کے سہارا طلب ہونے کو قرار دیں لیکن ایسے مسائل کی جن کا سبب فطری یا عقلی موجود ہو پیدائش کی توجیہ علم النفس یا علم الاجتماع سے کرنا بڑی ناانصافی ہے۔

فرائیڈ اور ان کے ہم خیالوں نے اپنے اس مفروضہ میں صرف یہی نہیں کہ خداپرستی کے فطری ہونے سے آنکھیں بند کرلی ہیں بلکہ عقلی اور استدلالی خدا شناسی سے بھی چشم پوشی فرمالی ہے۔ جس کی بنیاد قانون علت ومعلول کے اوپر ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ کچھ مسائل انسان کے اندرونی حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے پیدا ہونے کے سلسلے میں معقول رویہ یہ ہے کہ انسانی اسباب سے ابتدا کی جائے۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ ان کا محرک خود انسان کی فطرت اور عقل تو نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ منزل طے ہے کہ ان کے واسطے اکتسابی، خارجی اور غیر انسانی اسباب قرار دیے جائیں۔

مثلاً بعض اعداد کو عوام الناس منحوس سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس عقیدے کی عقلی بنیاد نظر نہیں آتی۔ انسان کے باطنی میلانات میں اس کا محرک نہیں ملتا۔ عقل ومنطق کی رو سے ہمیں ان کے اور دوسرے

اعداد کے درمیان کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں ہم بیرونی اسباب کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کون اس خیال اورعقیدے کی پیدائش میں دخیل ہوسکتا ہے۔

اب ہم ان اسباب کا جائزہ لینا شروع کرتے ہیں جو انسان کی فطرت اور قوت عقل وفہم کے دائرے سے باہر ہیں۔لیکن مذہبی عقائد ایسے مسائل ہیں جن کے لیے فطری، طبعی، عقلی، فکری اسباب موجود ہیں۔ وہ ان کی پیدائش کے لیے کافی ہیں۔

خدا پرستی کا مسئلہ انسان کے شادی بیاہ کے مسئلہ کے مانند ہے۔ انسان کی طبیعی خواہش، ذاتی میلان، فطری طلب از دواج کی طرف عورت اور مرد کو متوجہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے بعد اس گفتگو کا محل نہیں ہے کہ کیوں اور کس لیے انسان کو شادی بیاہ کی فکر ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی عقل اور فطرت خدا پرستی کے پیدا ہونے کا عظیم انسانی محرک ہے۔ بدیہی بات ہے کہ اس طرح کے داخلی اور فطری سبب کے ہوتے ہوئے دوسرے اسباب کی فکر غیر عاقلانہ اور غیر منصفانہ بات ہے۔ اس طرح کی کجروی ویسی ہی ہے کہ کوئی شادی بیاہ کے مسئلہ میں فطری اور طبعی خواہش کے باوجود یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ انسان جب حسین وجمیل مناظر کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کا دل چاہتا ہے کہ خود اس کے گھر میں اس قسم کے منظر ہوں تا کہ ہر وقت انھیں دیکھ کر وہ اسی طرح لطف اندوز ہو جس طرح پہاڑوں، بیابانوں میں ان مناظر کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتا ہے۔ عورت بھی حسین وجمیل اور خوش منظر ہے۔ انسان نے چاہا کہ وہ بھی مجھ سے نزدیک رہے۔ اس جذبہ نے اسے شادی بیاہ کے لیے آمادہ کیا۔

مسئلہ از دواج میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے کھیتی باڑی کے سامان کی شکل کو جب دیکھا تو اسے شادی کرنے کی فکر ہوئی۔ کیا مسئلہ از دواج کا جب داخلی، انسانی، فطری محرک موجود ہے تو اس قسم کے دوراز کار توجیہات نامعقول اور مضحکہ خیز نہیں ہیں؟

پھر یہ بھی دیکھیے کہ خدا پرستوں کے طبقہ میں کس کس طرح کے لوگ موجود ہیں۔ اگر یہ طبقہ صرف نادان، بے سود اور جاہل لوگوں پر مشتمل ہوتا تو کسی حد تک معقول تھا کہ یہ کہا جائے کہ مذہب اور وجود خدا کا عقیدہ نیچر کی بے رحم طاقتوں سے ڈر کا پیدا کیا ہوا ہے لیکن خوش قسمتی سے اس گروہ کے پیش رو علماء اور عقلاء ہیں۔ وہ کہ جو صرف یہی نہیں کہ طبیعی طاقتوں کو جانتے ہیں بلکہ انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ

ان پر کیوں کر قابو پایا جاسکتا ہے، ان کو کس طرح نقصان کے بجائے فائدہ رسانی کے کاموں میں لگایا جاسکتا ہے۔

آیا واقعی کہا جاسکتا ہے کہ سقراط، افلاطون، ارسطو، ابن سینا، رازی، طوسی، ابن ہثیم، ہزاروں مشرقی اور مغربی خدا پرست اہل علم کا ایمان جو سب کے سب علوم وفنون کے بانی اور علمی اسرار و رموز کا انکشاف کرنے والے تھے عالم مادہ کے غیظ وغضب سے ہراس کا نتیجہ تھا؟

خدا پرستی کی تاریخ بتاتی ہے کہ خدا کو ماننے والے طبقہ نے ہمیشہ اپنے عقیدہ کی وجہ قومی اصول اور معقول دلائل کی روشنی میں بیان کی ہے۔

خدا پرست علماء کی طرف سے ہزاروں کتابیں خداوند عالم کے وجود اور دوسرے مذہبی عقائد کو ثابت کرنے کے لیے لکھی گئی ہیں لیکن عام طور سے علمی اور استدلالی طریقۂ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ کہیں بھی یہ بحث نظر نہیں آتی کہ نیچر کے قویٰ چونکہ سنگ دل اور بے رحم ہیں لہٰذا ان سے چھٹکارے کے لیے ایک عظیم الشان پناہ گاہ کی انسان کو ضرورت محسوس ہوئی، اسی کا نام خدا ہے۔

افلاطون نے حدوث عالم کو خالق کے وجود کی دلیل قرار دیا ہے۔ ارسطو نے حرکت عمومی کے وجود کو وجود محرک کی نشانی جانا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر طرح کی حرکت محرک کی محتاج ہے۔ عالم مادہ میں ہر چیز متحرک نظر آتی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی ذات سے علیحدہ کوئی محرک ہو۔

یورپ کی علمی تحریک کے بعد علوم طبیعی کی ماہرین میں سے کچھ لوگوں نے مخصوص طرح کی دلیلیں قائم کر کے خداوند عالم کے وجود کو ثابت کرنا شروع کیا۔ مثلاً نیوٹن کہتا ہے کہ ایک دنیا کا کوئی مادہ ہرگز اس پر قادر نہیں ہے کہ رنگ برنگ کے موجودات پیدا کرے۔ یہ اختلاف وتنوع جو خلقت میں ہمارے سامنے ہے بتا رہا ہے کہ اس مادی ساز وسامان کے پیچھے کسی قدرت کا ہاتھ ہے جس نے اس مادے میں تصرف کیا ہے۔

مصنوعی دماغ کا موجد جب اس کی مشینری تیار کر چکا تو کہنے لگا کہ ایک مصنوعی دماغ جب بغیر انسانی عقل وتدبیر کے وجود میں آنے کے قابل نہیں ہے تو سچ مچ کا اصلی دماغ جو اس مصنوعی دماغ سے لاکھوں گنا زیادہ پیچیدہ اور پراسرار ہے بہر حال کسی بنانے والے کا محتاج ہے۔

آیا ان واضح دلائل کے بعد جو علوم وفنون کے بانیوں نے پیش کیے ہیں یہ کہا جاسکتا ہے کہ

نوع انسانی کے درمیانی خدا کا اعتقاد نیچر کی بے رحم طاقتوں سے خوف وہراس کا نتیجہ ہے؟

آج بھی خدا پرست اہل علم جو خدا کے وجود پر ایمان راسخ رکھتے ہیں کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے ہیں۔ان میں سے ہر ایک مضبوط، مستحکم عقلی دلیلوں کی روشنی میں خدا کے معتقد ہیں۔انھیں نیچر کی ظالم طاقتوں سے خوف وہراس نے خدا کے وجود کا قائل نہیں بنایا ہے۔

قرآن کا طریقۂ استدلال

قرآن مجید نے افرادِ انسانی کو خدا کے ماننے کا پیغام مختلف طریقوں سے دیا ہے۔اس نے اس سلسلے میں انسان کی فطرت اور عقل پر بھروسہ کیا ہے۔اس کی دلیلوں نے ان حکماء اور فلاسفہ کی عقلوں کو روشنی دی ہے جو نزولِ قرآن کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔

اس نے مبدأ خلقت کی طرف انسان کو طرح طرح سے متوجہ کیا ہے۔کبھی یوں فرمایا:

فَإِذَا رَكِبُوا فِيْ الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ (سورۃ العنکبوت:۶۵)

’’جب لوگ کشتی میں سوار ہوتے اور کشتی منجدھار میں پھنستی ہے تو وہ بڑے اخلاص کے ساتھ اپنی فطرت کی تحریک سے خدا کو پکارنے لگتے ہیں، لیکن جب خدا انھیں نجات دے دیتا ہے اور سلامتی کے ساتھ ساحل پر پہنچا دیتا ہے تو وہ بدستور ملحد بن جاتے ہیں۔‘‘

دوسرے رخ سے فرماتا ہے:

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُون. (سورۃ الطّور:۳۵)

’’آیا لوگ بغیر کسی علت کے خود بخود وجود میں آ گئے ہیں یا وہ خود اپنے خالق ہیں۔‘‘

چوں کہ یہ دونوں صورتیں غلط ہیں لہٰذا بلاشبہ کسی طاقت نے انھیں خلق کیا ہے۔کبھی اس نے کرۂ زمین اور دوسرے آسمانی کروں کے عجیب وغریب نظم وضبط سے خدا کے وجود پر استدلال کیا ہے۔

أَفِيْ اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ. (سورۃ ابراہیم:۱۰)

''آیا اس خدا کے وجود میں شک ہے جس نے زمین اور آسمان پیدا کیا ہے۔''

کبھی اس بات سے وجود خدا کو ثابت کیا ہے کہ ایک قسم کے مادے سے اسی پانی اور اسی مٹی کے ذریعہ مختلف طرح کے پھل وجود میں آتے ہیں۔

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَزَرْعٌ وَنَخِيلٌ صِنْوَانٌ وَغَيْرُ صِنْوَانٍ يُسْقَى بِمَاءٍ وَاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلَى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ. (سورۃ الرعد:۴)

''کرۂ زمین میں ایک دوسرے سے نزدیک مختلف قسم کے ٹکڑے ہیں، انگور کے باغ ہیں، کھیتیاں ہیں، خرمے کے درخت ہیں، تخمی اور قلمی دونوں قسم کے، سب کو ایک طرح کے پانی سے سینچا جاتا ہے، لیکن ہم نہیں تو کون ہے جس نے مزے کے لحاظ سے ایک کو دوسرے پر برتری دی ہے۔ اس تنوع اور اختلاف میں اس کے باوجود کہ سب ایک پانی سے سینچے جاتے ہیں۔ ہمارے وجود کی نشانیاں صاحبانِ عقل کے لیے ہیں۔''

قرآن مجید کے علاوہ اس کا ذکر ان تحریف شدہ آسمانی کتابوں میں بھی کہیں نہیں ملتا کہ نیچر کی قوتوں سے بچنے کے لیے خدا کی ذات کو پناہ گاہ قرار دینا چاہیے۔ مادہ پرست قرآن کو آسمانی کتاب نہیں مانتا نہ سہی لیکن اسے تسلیم کرتا ہے کہ وہ لوگوں کی ہدایت کے لیے ایک عظیم ترین خداشناسی کی کتاب ہے، کیوں کہ اس کتاب میں اس کے نظریے کا تذکرہ نہیں ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ تمام گزشتہ ادوار انسانیت میں خدا کی طرف راہنمائی سب سے پہلے انسان کو فطرت نے کی ہے۔ اس کے علاوہ کائنات کا وہ ہمہ گیر نظم و ترتیب ہے جس نے لوگوں کو وجود خدا کا قائل بنایا ہے۔ انسان یہ جانتا تھا کہ قانون علت و معلول کے دائرے میں یہ سہارا عالم ہے۔ یہ وہ انتہائی قدیم قانون ہے جو انسان کے تمام ادوار زندگی میں اس کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کی پوری عمر بہشت بریں میں گزرے جہاں اس کی آسائش کے تمام وسائل موجود ہیں، جہاں کوئی چیز نقصان رساں، خطرناک، تکلیف دہ نہیں ہے تو بھی وہ وہاں کے

خوشنما مناظر دیکھ کر وہاں کی چیزوں میں نظم وضبط کا مشاہدہ کر کے یہی طے کرے گا کہ اسے کسی صاحبِ عقل وشعور وصاحب طاقت نے پیدا کیا ہے، اس نے یہ مناظر خلق کیے ہیں۔ جب تک وہ اس نتیجہ پر نہیں پہنچ لے گا ہرگز چین سے نہیں بیٹھے گا اور غور وخوض سے باز نہیں رہے گا۔

کیا یہ انصاف کا خون نہیں ہے کہ مذہبی تصورات کی پیدائش کے لیے داخلی اور انسانی سبب فطرت اور عقل کے ہوتے ہوئے یہ کہا جائے کہ ان کا سرچشمہ حوادث روزگار سے خوف اور انسان کا بچپنے سے طفیلی اور سہارا طلب ہونا چاہیے؟

یہ جدائی کیسی؟

جبکہ خوف، خدا پر ایمان لانے کی علت ہے تو ہم علت ومعلول کے اصول سے قرار پاجاتے ہیں۔ اس اصول کی خصوصیات یہاں موجود ہونی چاہیے۔

یہ نہیں ہوسکتا کہ انسانی تاریخ کے ایک حصے میں یہ اصول منطبق ہو کیوں کہ علت ومعلول کا قانون زمان ومکاں کی حدود سے بالاتر ہے، ہمیں جس جگہ اور جس زمانے میں، جن حالات میں نیچر کی طاقت سے یا کسی اور سبب سے افراد انسانی خائف نظر آئیں اسی کا لحاظ کرتے ہوئے اتنے ہی وہ خدا کے وجود کے معتقد نظر آنے چاہئیں۔ خوف تمام زمانوں میں انسانیت کا ہمزاد رہا ہے۔ آج بھی خوف سے اسے چھٹکارا نہیں ہے، ممکن ہے کہ نیچر کی طاقتوں پر انسان نے قابو پالیا ہو، لیکن انسان صرف انہی چیزوں سے تو خائف اور ہراساں نہ تھا۔ برٹرنڈرسل نے صراحت کی ہے کہ انسان خود اپنے نفسانی تقاضوں سے بھی ڈرتا ہے۔ وہ جنسی خواہشوں کے تسلط سے بھی خائف ہے۔ کہیں اس کی جنسی خواہش اسے تباہ وبرباد نہ کردے۔ خیر ہوسکتا ہے کہ عزت ناموس اس تعلیم یافتہ اور روشن خیال دور میں ایک بے حقیقت چیز سمجھی جائے، جنسی خواہشوں کے تسلط سے آبروریزی بے معنی چیز قرار پائے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ یہی جنسی خواہش کا طوفان اور ہیجان انسان کو ایسا اندھا بنا دیتا ہے کہ وہ ہر طرح اس کے پورا کرنے پر تل جاتا ہے۔ اسے اس کی بھی پروا نہیں رہتی کہ اس کی صحت جواب دے دے گی۔ وہ انتہائی تکلیف دہ بیماریوں کا شکار ہوجائے گا۔

فرض کرلیجیے کہ انسان نے نیچر کو قابو میں کرلیا، خطرناک سے خطرناک امراض کے علاج کا

راستہ معلوم کرلیا ہے، وہ زمانے لد گئے جب وہ زلزلے سے، طوفان سے، آندھی سے ڈرتا تھا، بجلی اور بادل کی گرج سے اس کا دل دہلتا تھا، دق، سل، کینسر سے خائف تھا، لیکن کیا انسان یہی طاقت ور، مقتدر، واقف کار، عقل کا پتلا، علم کا مجسمہ انسان جنگ سے بھی نہیں ڈرتا ہے؟ غالبًا کسی دور میں جنگ سے انسان اتنا خائف نہ تھا جتنا آج خائف ہے۔ پچھلے زمانے میں وسائل نقل وحمل سست اور کم تھے؟ آج تیز ترین ہوائی جہاز موجود ہیں۔ اگلے زمانے میں انسان کے ہاتھ میں کون سے ہتھیار تھے۔ وہی کہ جو دنیا کے میوزیم میں لوگوں کو دکھانے کے لیے الماریوں میں رکھے ہوئے ہیں؟ خصوصیت سے جب سے ایٹم بم انسان کے بس میں آیا ہے اس وقت سے جنگ کا ہیولیٰ بالکل بدل گیا ہے۔ گزشتہ دور میں جنگ کی وجہ سے کوئی ایک حصۂ زمین تباہ ہوتا تھا۔ اب پورے کرۂ ارض کو نیست و نابود کیا جا سکتا ہے۔ بڑی ہولناک بات یہ ہے کہ علم وصنعت میں انسان برابر ترقی کر رہا ہے۔ یہ ترقی جہاں ہر شعبۂ زندگی کی سطح کو اونچا کرتی ہے وہاں اسلحہ سازی کے میدان میں بھی انسان کے قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔

پھر سفر فضائی کے سلسلے میں امریکہ اور روس کے درمیان جو دوڑ ہو رہی ہے اس نے جنگ کی شکل کو اور زیادہ ہولناک بنا دیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ خوف وہراس کے تمام اسباب مل کر انسان کو اتنا نہیں ڈرا سکے جتنا موجودہ دور میں تنہا خطرۂ جنگ نے اسے خائف بنایا ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس سے عوام اتنا ہراساں نہیں ہیں جتنا خواص، جاہل اتنا خائف نہیں ہیں جتنا تعلیم یافتہ، غیر سائنسداں اتنا نہیں ڈرتے جتنا سائنسداں ڈرتے ہیں۔ جس کے معلومات جتنے وسیع اور عمیق ہیں اتنا ہی وہ جنگ سے زیادہ ڈرتا ہے۔

جبکہ علت اس دور میں زیادہ طاقت اور شدت سے موجود ہے تو اس کے معلول خدا پر ایمان کو بھی اتنی ہی طاقت اور شدت سے موجود ہونا چاہیے۔ عوام سے زیادہ خواص کو خدا کا معتقد نظر آنا چاہیے۔ جاہلوں سے زیادہ تعلیم یافتہ، غیر سائنسداں طبقہ سے زیادہ سائنس دانوں کا ایمان پختہ اور راسخ ہونا چاہیے۔ کیا واقعاً ایسا ہی ہے؟ پھر یہ معلوم کرنا چاہیے کہ علت سے جدائی کیسی؟

مذہب نے خوف نہیں گھٹایا

انسان کو انصاف کا دامن کبھی اور کسی کے مقابل نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ہم مانے لیتے ہیں کہ

اس بات کا احتمال ہے کہ ابتدائی دور انسانیت میں خدا کا عقیدہ خوف کو کم کرنے کے لیے یا اس سے چھٹکارے کے واسطے ایک ملجا و ماویٰ کے طور سے تھا، لیکن اس دور میں انسان کے فہم و شعور کی سطح چونکہ پست تھی، اس خوف کا اصلی سرچشمہ انسان کی ناتوانی اور جہالت تھی۔ یقیناً ابتدائی انسان بہت ناتواں اور جاہل تھا۔ اس کی موجودگی میں یہ احتمال بہت کمزور ہے کہ وجود خدا کے عقیدے نے خوف کو دور کر دیا ہو۔

لطف یہ ہے کہ بالفرض اگر ایک طرف خدا پر ایمان نے نیچر کی ظالم طاقتوں سے انسان کے خوف کو کم کیا تو دوسری طرف خدا کی ناراضگی کے خوف نے انسان کو زیادہ متوحش بنا دیا ہے۔ نیچر کی طاقتیں تو صرف انسان کی دنیوی زندگی کی بربادی کا سبب بن سکتی ہیں لیکن خداؤں کا بگڑ جانا اس کی دنیا اور آخرت کو تباہ کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ یہی خدا کی ناراضگی کا خوف تھا جس نے مصر کے لوگوں کو مجبور کر دیا کہ دریائے نیل کے خدا کا غصہ فرو کرنے کی غرض سے وہ ہر سال ایک حسین و جمیل لڑکی اس کی موجوں کے سپرد کر دیں۔

ہمارے نزدیک نہ سہی لیکن برٹرنڈ رسل کے ارشاد کے مطابق خدا پر ایمان نے جنگ سے وحشت اور ہراس کو بھی کم نہیں کیا بلکہ مذہب نے جنگ کی آگ کو اور بھڑکایا، تاریخ کے ابتدائی ادوار میں اکثر و بیشتر جنگیں مذہب کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ اسی کو دلیل قرار دیتے ہوئے برٹرنڈ رسل نے کہا ہے کہ:

''انسانی تاریخ میں مذہب کے عواقب، نتائج اکثر و بیشتر نقصان رساں نظر آتے ہیں۔''

ایک مچھلی نے پورا تالاب گندہ کیا

اکثر وہ لوگ جنھوں نے خدا کے عقیدے کی پیدائش کا سبب خوف کو قرار دیا ہے انھیں مخصوص ماحول نے اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ خدا پرستی کے محرکات کا جائزہ لینے کے موقع پر ہر مذہب کے خصوصیات کی مستقل اور جداگانہ تحقیق کرتے۔

عام طور سے یہ لوگ کلیسا کی تعلیمات اور نظریات سے متاثر ہیں۔ یہ اس کے خلاف اظہار ناراضگی میں کبھی دریغ نہیں کرتے، برابر اس پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ موقع ملتا ہے تو اچھی طرح اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ مسیحیت کے ارباب بست وکشاد کی کج اندیشی، غالط روش، غیر اطمینان مسیحیت نے مذہب کے مخالفین کا طبقہ پیدا کیا۔

جب کلیسا کی تعلیمات ایسی نامعقول اور مضحکہ خیز ہوں کہ اس کے مذہبی رہنماؤں کے قیمتی مباحث میں سے ایک یہ ہو کہ خدا کی دونوں آنکھوں کے درمیان چھے ہزار فرسخ کا فاصلہ ہے تو اس کے بعد اہلِ علم اور صاحبانِ عقل کا مذہب کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا اور مور چہ بندی کرنا لازمی تھا۔لیکن بے انصابی کی بات یہ ہے کہ عیسائیت سے دشمنی نے مطلق مذہب کا دشمن کیوں بنادیا؟

صرف مسیحیت کے خلاف مور چہ بنایا جاتا تو ہمیں شکایت نہ ہوتی لیکن ہر مذہب کے مقابلہ میں کیوں صف آرائی کی گئی؟ اب جو کچھ کہا جاتا ہے وہ صرف مسیحیت کے بارے میں نہیں بلکہ بلا کسی قید وشرط کے مذہب اور خدا پرستی کے متعلق ادعاء کیا جاتا ہے کہ وہ تخیل کی ساختہ و پرداختہ ہے، خدا کا عقیدہ خوف سے نجات کی خاطر قائم کیا گیا ہے، ہولناک طبیعی حوادث کے مقابلہ کے لیے انسان کو ایک پناہ گاہ کی تلاش تھی۔اس نے خدا کی ذات کو یہی پناہ گاہ قرار دیا ہے۔

عمومی طور سے مذہب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دین ہرگز انسانی معاشرے کے مشکل اور پیچیدہ مسائل کو حل نہیں کرسکتا کیوں کہ روحانی دنیا کا جو تصور ہمارے دماغ میں ہے اس میں دنیوی اور مادی مسائل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بڑے بڑے پیغمبروں اور علماء وحکماء نے ان مشکلات کے متعلق جو انسان کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں سوائے پند ونصیحت کے کچھ نہیں بتایا ہے۔

یہ روشن خیال اہلِ علم کاش عیسائیت کے علاوہ دوسرے ادیان و مذاہب کے تعلیمات کی بھی تحقیق کرتے۔خصوصیت سے انھوں نے کم از کم اسلام کا مطالعہ کرلیا ہوتا۔اور یہ دیکھتے کہ دنیا کے تصور کے متعلق اسلام کا فلسفہ اور اس کی منطق کتنی گہری اور معقول ہے۔اس کے احکام اور قوانین میں کیسی ہمہ گیری ہے۔

ممکن ہے کہ مسیحیت اس قابل ہو کہ اس کے متعلق اس طرح کے معاندانہ فیصلے کیے جائیں لیکن اسلام کا دامن تو تمام عیوب ونقائص سے پاک ہے، مسیحیت کا غصہ اس پر کیوں اتارا جائے؟

اسلام میں تو کوئی اس قسم کا مسئلہ موجود نہیں ہے کہ خدا کی دو آنکھوں کے درمیان چھے ہزار

فرسخ کا فاصلہ ہے۔ اسلام معرفت خدا کا بہترین مکتب ہے۔ اس میں نہایت باریک بینی سے خدا کی تنزیہ وتقدیس کی گئی ہے۔ اس کے تمام مذہبی عقائد انتہائی معقول اور مستحکم علمی وفلسفی بنیادوں پر استوار ہیں۔ اس کے تمام قوانین واحکام عقلی فیصلوں کے مطابق ہیں۔ اسلام کو عیسائیت کے ساتھ ایک لکڑی سے کیوں ہنکایا جاتا ہے۔

جنسی خواہشوں سے ہراس!

رسل نے خوف کا تیسرا سبب انسان کی شدید جنسی خواہشوں کو قرار دیا ہے جو اسے نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان اپنے مطلق العنان جنسی میلانات سے ڈرتا ہے، اسی خوف کی وجہ سے اس نے خدا کو مانا ہے۔

اس کے متعلق عرض ہے کہ انسان فطری طور سے اس کا محتاج ہے کہ جنسی میلانات کو اپنے قابو میں رکھے۔ اگر انھیں آزاد چھوڑ دے گا تو اس میں جسمانی یا نفسیاتی نقص پیدا ہوجائے گا، وہ کمزور ہوجائے گا، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ کسی خطرناک جسمانی بیماری میں مبتلا ہوجائے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے ذہن اور حافظے پر اثر پڑے۔ ظاہر ہے کہ انسان فطرتاً نقائص سے متنفر ہے، وہ کمال پسند واقع ہوا ہے۔ یہی کمال پسندی کا جذبہ اسے ہوس رانی سے بچا سکتا ہے اور اس کا محرک ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی جنسی پیاس کو بجھانے کے لیے معقول حدود سے قدم آگے نہ بڑھائے۔

کمال دوستی کے اس فطری تقاضے کے علاوہ یقیناً خدائے حاضر وناظر کا عقیدہ، عالم آخرت کی جزا اور سزا کے تصورات بھی جنسی خواہشوں میں توازن واعتدال پیدا کرنے کا سبب ہیں۔ درحقیقت جنسی خواہشوں کے طغیان نے جس طرح کمال دوستی کا جذبہ نہیں پیدا کیا ہے اسی طرح خدا کے وجود اور آخرت کی جزا وسزا کا عقیدہ بھی نہیں پیدا کیا ہے۔

اطمینان قلب ایمان کا نتیجہ ہے

جن لوگوں نے خوف کو یا زیادہ صحیح لفظوں میں کہا جائے تو انسان کی اطمینان قلبی کو مذہب کی پیدائش کا سبب قرار دیا ہے، انھوں نے نتیجہ اور فائدے کو علت کی جگہ رکھ دیا ہے۔ اطمینان اور سکون ایک

ایسی نفسیاتی حالت ہے جو انسان کو مذہب کا معتقد ہونے کے بعد نصیب ہوتی ہے۔ بے دینی اضطراب انگیز ہے اور دین داری امن وامان اور اطمینان کا سامان۔

اگر فلسفیانہ رخ سے دیکھا جائے تو زیادہ سے زیادہ کہا جاسکتا ہے کہ انسان کی اطمینان طلبی مذہب کا خلاصہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی مذہب کا پابند اس لیے نہیں ہوتا ہے کہ اسے سکون قلب کی دولت ملے بلکہ معتقد ہونے کے بعد اس میں یہ نفسیاتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جائے کہ سچا مذہبی شخص ہونے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کا دل ساکن اور مطمئن ہو جاتا ہے۔ اسی لیے علم الاجتماع اور علم النفس کے ماہرین اور تمام ان لوگوں نے مذہب اور دینی اعتقادات کی طرف افراد انسانی کو دعوت دی ہے جو اس خشک اور بے روح دنیا میں انھیں اضطراب، بے چینی اور دکھ درد سے نجات دینا چاہتے ہیں۔ یہ ایک دوسری بات ہے کہ مغربی دنیا کو جس اطمینان قلب کی خواہش ہے وہ اسے مسیحیت کی پیروی میں ملے گا یا نہیں؟ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مغرب کی اس اطمینان طلبی کا سرچشمہ خالص مادی تفکر اور دنیا پرستی ہے۔ بے شک مذہب انسان کو اطمینان دیتا ہے لیکن وہ اطمینان نہیں کہ جس کے سایے میں اذہان بغیر کسی دغدغہ کے اپنے مطلق العنان، سرکش جنسی میلانات کو زیادہ سے زیادہ پورا کرے اور اپنی بے روح، معنویت سے محروم زندگی کی گاڑی کو بے دریغ آگے بڑھائے۔

مذہب انسان کو اطمینان قلب اور سکون نفس دیتا ہے لیکن ایسا اطمینان وسکون جو ذمہ داری کے شدید احساس کے ساتھ ساتھ ہے، ایسا اطمینان وسکون جس میں زندگی کے معنوی پہلو مادی گوشوں پر تفوق رکھتے ہیں، ایسا سکون واطمینان جس میں آزادی اور مطلق العنانی نہیں ہے بلکہ انسان کے کاندھوں پر مذہبی احکام کی تعمیل کی ذمہ داری ہے۔ (جاری)

(ماخوذ از: اسلام اور عصرِ جدید، جلد:۸، شمارہ:۲، اپریل ۱۹۷۶ء)

ہندومت ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

(لفظ ہندو کی تحقیق: تاریخ، مذہبی مصادر، تہوار اور فرقے)

ظفر دارک قاسمی

■ ■ ■

ظفر دارك قاسمی *

ہندومت ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ

(لفظ ہندو کی تحقیق: تاریخ، مذہبی مصادر، تہوار اور فرقے)

ہندوستانی تہذیب وتمدن کی خاصیت یہ ہے کہ یہاں مخلوط سوسائٹی پائی جاتی ہے۔مختلف افکار ونظریات کا وجود ہندوستان کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔ ہندوستان میں ہندوازم بہت قدیم مذہب ہے۔اس کی تاریخ مبہم ہے اور مختلف افکار، ومتضاد اعتقادات ونظریات اور رسومات کا مجموعہ بھی۔البتہ ہندودھرم کو معاشرے کے ایک بڑے طبقہ نے اپنا نظام حیات تسلیم کیا ہے۔ ہندوستان کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ابتداء سے آج تک یہاں متعدد مذاہب اوران کے ماننے والے وجود میں آئے ہیں۔

لفظ ہندو کی تعریف وتحقیق

یہ حقیقت ہے کہ اسلام اور عیسائیت کے بعد ہندومت دنیا کا تیسرا بڑا مذہب ہے ۔اس مذہب نے ہندوستان میں نشوونما پائی۔ ہندودھرم کے ماننے والے تقریباً تمام افراد ہندوستان ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔چین، امریکہ، یوروپ اور چندریاستوں کے ہندو باشندوں کا تعلق بھی ہندوستان سے

* پوسٹ ڈاکٹریٹ فیلو،شعبۂ سنی دینیات،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ zafardarik85@gmail.com

ہی ہے۔

لفظ 'ہندو' دراصل 'سندھو' لفظ سے بنا ہے جو دریائے سندھ کے دونوں اطراف یعنی برصغیر کے باشندوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بعض مؤرخین کے نزدیک لفظ 'ہندو' کا استعمال پہلے شمال مغربی سمت سے آئے ہوئے ایرانیوں نے کیا اگرچہ یہ لفظ بہت ہی قدیم زمانے سے استعمال ہوتا رہا ہے۔ محققین کی تحقیق یہ ہے کہ ہندوؤں کی کسی قدیم سنسکرت کتاب میں یہ لفظ 'ہندو' نہیں ملتا ہے۔ ہاں 'ہندو' پارسیوں کی 'ژند' اور 'اوستا' میں ملتا ہے۔ مذہبی تناظر میں اس لفظ 'ہندو' کا استعمال تقریباً اٹھارہویں صدی عیسوی میں انگریز مصنفین کی جانب سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے علاوہ دوسری قوموں کے لیے ہوا۔ بحیثیت ایک مذہبی جماعت کے لفظ 'ہندو' ہمیں اس دھرم کی مقدس کتابوں میں نظر نہیں آتا ہے۔[۱]

پنڈت جواہرلال نہرو اپنی مشہور کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" میں لکھتے ہیں:

> ''لفظ ہندو کا قدیم ترین استعمال ہمیں آٹھویں صدی عیسوی میں ملتا ہے لیکن وہاں بھی یہ لفظ کسی خاص مذہب کے متبعین کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ محض ایک قوم کے لیے ہوا۔ لفظ ہندو کا استعمال مذہبی تناظر میں بہت بعد میں ہوا۔''[۲]

اس طرح سرسوتی سوامی اپنی ممتاز تصنیف The Universal Way of Life میں رقمطراز ہیں:

> ''ماضی میں 'ہندومت' ہمارے مذہب کا نام نہیں تھا، بلکہ یہ مذہب ویدک ماتا، ویدک دھرم، یا سناتن دھرم کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ہمارے اصل (مذہبی) مصادر (Primary Sources) ہمارے ایمان وعقائد کسی بھی نام سے منسوب نہیں کرتے۔''

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ مطلب اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوازم کا اصل نام سناتن دھرم یا ویدک دھرم ہے لیکن ہندومت کے متبعین کو اس حقیقت کے متعلق ذرہ برابر بھی تامل نہیں بلکہ فخر ہے۔

سوامی جی آگے رقم طراز ہیں:

> ''ہمارا مذہب تمام مذاہب سے بہت پہلے دنیا بھر میں تب موجود تھا جب

کوئی دوسرا مذہب موجود نہیں تھا۔ لہٰذا ہمارے مذہب کو کسی نام سے موسوم
کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جب مجھے یہ بات سمجھ میں آئی تو میں نے
سوچا کہ اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں بلکہ یہ باعث افتخار ہے۔''[۳]

ہندومت علماء ادیان کی نظر میں

یہ بھی عرض کیا جانا ضروری ہے کہ ہندومت کی کوئی جامع اور مستند تعریف محققین نے پیش نہیں کی ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اپنی کتاب "الجہاد فی الاسلام" میں لکھتے ہیں کہ:

''ہندو مذہب وہی ہے جو ایک ہندو کرتا ہے۔''[۴]

اسی طرح بعض ماہرین کا کہنا یہ بھی ہے کہ

''وہ ان رسوم، عبادات، عقائد، روایات اور ضمنیات کا مجموعہ ہے جن کو برہمنوں کی تعلیمات نے پھیلایا۔''[۵]

ہندوازم کی جامع اور مانع تعریف کی دشواری کو ایک مستشرق John Clork Archer اپنی کتاب The Great Religians of Modren World میں لکھتا ہے:

''آپ یہ سمجھ لیں کہ ہندومت کا بانی ایک بہت بڑا گروہ ہے جس کی شخصیات تاریکی میں چھپی ہوئی ہیں۔''[۶]

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اسی وجہ سے "الجہاد فی الاسلام" میں دوسرے مقام پر رقمطراز ہیں۔ یعنی ہندومت کے مطالعہ میں سب سے پہلے جو مشکل پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ

''وہ کس چیز کو ہندومت قرار دیں کیونکہ ہندویت ان معنوں میں کوئی مذہب ہی نہیں ہے کہ جن میں عموماً یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔''[۷]

اس میں مختلف گروہ کے عقائد وطریقے اور یہاں تک کہ کتب بھی مختلف ہیں مگر اس کے باوجود تمام گروہ ہندو کہلاتے ہیں۔ یہ امر عملی زندگی اور مخلوط معاشرہ میں کس قدر دشواری کا سبب بنتا ہے اس کی ایک جھلک ذیل کے اقتباس سے واضح ہوتی ہے جس میں مردم شماری کے موقع پر ہندو کی یہ

تعریف کرنا پڑی۔

''وہ تمام باشندگان ہند جو اسلام، جین مت، بدھ مت، مسیحیت، پارسی مذہب، یہودی مذہب یا دنیا کے کسی دوسرے مذہب سے تعلق نہیں رکھتے اور جن کا طریقہ عبادت وحدانیت سے لیکر بت پرستی تک محیط ہو، اور جن کے دینیات مکمل طور پر سنسکرت میں لکھے ہوں، ہندو ہیں''[۸]

مذکورہ اقتباس اس بات پر واضح دلالت کر رہا ہے کہ ہندومت میں کسی وحدت اور مرکزیت کی تلاش یقیناً سعی لا حاصل ہے۔ معاملہ عقائد و عبادات کا ہو یا سماجی رسوم و رواج کا، کسی پہلو سے بھی ہندوؤں کے مابین کامل اتفاق نہیں پایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن اپنی کتاب The Hindu View of Life میں لکھتے ہیں:

''اسے زندگی گزارنے کا طریقہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، اس کے مدمقابل کہ آپ اسے کسی خاص خیال وعقیدہ کا حامل سمجھیں۔ اگر خیالات کی دنیا میں یہ لوگوں کو پوری آزادی دیتا ہے تو دوسری طرف لوگوں کو ملک کے باضابطہ رسوم و رواج کو پورا کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ خدا مانتے ہوں یا نہیں، سب اپنے آپ کو ہندو کہہ سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کی تہذیب اور اطوار زندگی پر عمل پیرا ہوں۔''[۹]

جو لوگ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے متعلق جانتے ہیں وہ یہ بات بھی بخوبی جانتے ہیں کہ ہندومت کی تاریخ، فلسفہ، عبادات، رسوم و رواج پر ان کا تحقیقی نقطۂ نظر اجمالاً اس کے سوا کچھ نہیں ہے:

''ہندومت کسی خاص مضبوط اور مستحکم عقیدے کا مذہب نہیں ہے بلکہ وسیع اور پیچیدہ ہے، البتہ روحانی تجربات اور خیالات کا ایک عظیم مجموعہ ضرور ہے۔ اور زمانہ قدیم سے انسانوں کی خدا تک رسائی کی کوششوں کی روایات کا تواتر ہے۔ اور اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے کہ جس کے نتیجے میں ہندومت بہت سے مسائل اور تقریباً بے انتہا گونا گوں رنگوں کا منقش پردہ بن گیا ہے۔''[۱۰]

اس لیے اگر ہندومت کے محققین سے اس کی جامع تعریف اور توصیف کا مطالبہ کریں یا اس سلسلے میں ان کی محققانہ روش کا ملخص دریافت کریں تو جواب حتمی صورت میں اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ چنانچہ پنڈت جواہرلال نہرو اپنی ایک مشہور تالیف An Autobiography میں تحریر کرتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ جس بات کو ہندو دھرم سے موسوم کیا گیا ہے اس کا تعلق دھرم سے نہیں بلکہ ایک تاریخی سفر سے ہے جس کی بہت سی کڑیاں گم ہیں، اور بہت سے حقائق تاریخ کے پردے میں چھپ کر رہ گئے ہیں۔ تاریخی روایات کا جو سلسلہ ویدوں کے زمانہ سے کچھ رسم ورواج کو لیکر شروع ہوا تھا، اس میں بہت کچھ اضافہ ہوتا رہا ہے۔ وہ اس کے رسم ورواج اور خیالات وتصورات کو اپنے اندر ضم کرتا چلا گیا اور زمانہ حال تک یہی اس کا مزاج ہے۔''۔ [۱۱]

خواجہ حسن نظامی دھلوی اپنی مشہور ومعروف تصنیف ''کرشن بیتی (جس کا نام بدل کر بعد میں کرشن جیون رکھا گیا ہے)'' میں رقم طراز ہیں:

''قوموں کے تاریخی حالات سے بخوبی ثابت ہے کہ ہندوؤں کا مذہب سب سے قدیم ہے، جس زمانہ میں مصر اور یونان اور روم کے مذاہب کی بناء بھی نہ پڑی تھی اور اہل دنیا کے کان ان سے آشنا بھی نہ تھے، اس مذہب کی عمارت اس سے بہت پہلے تیار ہو چکی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ہندو مذہب قدیم زمانہ کے مذاہب میں سے نہایت شاندار اور عجیب وغریب ظاہر ہوا۔ یہ کوئی ایک مذہب نہیں ہے نہ اس کی عمارت کی طرز تعمیر ایک وضع پر ہے، اس مذہب کو ایک مشرقی طرز کے نہایت خوشنما عظیم الشان اور وسیع محل سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ دیکھنے سے منزل پر منزل چنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ہندو مذہب ایک مذہب نہیں بلکہ مذاہب کا مجموعہ ہے جن کو مجتمع کر کے ان کی مختلف خاصیتوں سے ان کو ترتیب دیا گیا ہے، اس وجہ سے

اس کو معجون مرکب کہنا بے جانہ ہوگا۔ یہ مذہب دیگر مذاہب کی طرح ایک ہی شخص نے ایک ہی وقت میں وضع نہیں کیا بلکہ اسے مختلف رہنماؤں، رشیوں اور سنتوں نے جو مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے ہزار سال کے عرصے میں بنایا ہے۔ یہ مذہب کسی ایسے نقشہ نویس کا بنایا ہوا نقشہ نہیں ہے، جو کسی ملک کے ایک ایک راستہ کی پیمائش کرتا ہے اور جنگلوں کی پگڈنڈیوں سے لیکر شہروں کی سڑکوں تک کا نقشہ کھینچ کر دکھاتا ہے بلکہ ایسے نقشہ نویس کا نقشہ ہے جس نے کسی اونچے پہاڑ پر بیٹھ کر عکس لیا ہے اور شہروں کو نقطوں کے ذریعہ سے نقشہ بنا کر دکھایا ہے، مذہب ہنود بہت بڑا ذخیرہ ہے مذہبی خیالات کا اس میں نہ باطل عقائد کا نشان ہے نہ کفر و بت پرستی کا بلکہ یہ ایسا مذہب ہے کہ اس کے نکات اور عظمت دریافت کرنے کے لیے مقدس رشیوں اور دیوتاؤں کے طریق علم و عمل کو دیکھا جائے تو خدا پرستی کی پوری شان اور توحید کی حقیقی تصویر نظر آئے گی۔ ہندو مذہب کا اصل الاصول بالکل اس کے مصداق ہے **من عرف نفسه فقد عرف ربه**۔"[١٢]

اس طرح کی بات ڈاکٹر رادھا کرشنن اپنی معروف کتاب Indian Philosophy میں لکھتے ہیں کہ

"ہندومت کی بنیاد کسی شخص (خاص) پر نہیں رکھی گئی بلکہ وہ موروثی خیالات واحساسات جو آباء و اجداد سے منتقل ہوتے ہوئے موجودہ نسل تک پہنچے ہیں وہ سب ہندو وجود کا جزو ہیں۔ اس طرح ہر قوم اور نسل کا مشترک طور پر اس میں حصہ ہے"[١٣]

چنانچہ یہ بات واضح ہوگئی کہ ہندومت کو تاریخی اور وراثتی طور پر ہی زیر بحث لایا جاسکتا ہے۔ اس تصور کو پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہندومت مختلف و متضاد افکار و نظریات کا مرقع ہے:

"ہندو دھرم بہت سے اختلافات کا حامل ہے۔ متضاد قسم کے تصورات

اور روایات اس میں شامل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو دھرم کے لیے حقیقی معنوں میں دھرم کا لقب درست نہیں ہے''[۱۴]

اسی نقطۂ نظر کی تائید ڈاکٹر رادھا کرشنن اپنی ممتاز تصنیف Eastern Religion WesternThought میں لکھتے ہیں:

''ہندو مذہب ہر قسم کے مذہبی احساسات و جذبات اور رسم و رواج کا ایک مرکب سا بن گیا ہے۔ خدا کے بارے میں کسی بھی قسم کا اعتقاد جو کبھی انسان قائم کر چکا ہو یا جس کا اسے کبھی احساس ہوا ہو اس نے بغیر جھجک کے فوراً اسے قبول کر لیا۔''[۱۵]

ہندو دھرم کے معروف اسکالر سوامی وویکانند نے لکھا ہے کہ:

''ہر قسم کے لوگ مثلاً بت پرست، کئی دیوتاؤں اور دیویوں پر ایمان رکھنے والے، بدھ مت کے پیرو جو خدا کی ہستی کا نہ اقرار کرتے ہیں نہ انکار، ہندو دھرم میں ایک درجہ رکھتے ہیں۔''[۱۶]

چنانچہ اس تناظر میں یہ امر واقعہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کا احساس مبنی برحقیقت ہے کہ ''ہندو مت دھرم کی تعریف میں نہیں آتا۔''[۱۷]

ویدک دھرم/ سناتن دھرم

البتہ اس بے نام مذہب کو پہنچاننے کے لیے ایک معروف اصطلاح ویدک دھرم بھی ہے۔ ویدک دھرم کے معنی ماہرین نے ویدکا دھرم بیان کئے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ عموماً سناتن دھرم کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ سناتن سنسکرت کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں 'سدا سے سیدھا چلا آنا'۔ گویا یہ بات صاف ہوگئی کہ علماء ادیان کے مطابق ہندومت ان معنوں میں کوئی مذہب نہیں ہے جن میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے یعنی ایک جامع اور مکمل طرز حیات ہندو دھرم حقیقت میں ایک مذہب کا نام نہیں ہے بلکہ یہ دنیا کی قدیم مختلف اقوام کے مذاہب کا ایک منفرد مجموعہ ہے۔ اس وجہ سے ہمیں ہندومت کی ایک جامع و مانع تعریف آج تک میسر نہیں ہوئی۔ اسی مشکل سے بچنے کے لیے Nirad.C.Chaudhri نے اپنی

کتاب Hinduism میں یہ تجویز پیش کی ہے:

''ان مشکلات سے بچنے کے لیے مبتدی کو یہ باور کرانا چاہئے کہ وہ پیشگی اس بات پر ذہنی طور پر تیار ہو جائے کہ وہ ایک ایسے مذہب ہندو دھرم کے بارے میں جاننے چلا ہے جو منفرد نوعیت اور مختلف حیثیت کا حامل ہے۔ اسے جاننے کے لیے خاص طرز کا مطالعاتی رویہ ہی اسے حقیقت سے قریب تر کر سکے گا۔''[۱۸]

نرادسی چودھری کے اس تحقیقی حل کو اصول بنا کر محقق ہندومت کا مطالعہ و تحقیق کرے اور مطالعہ مذاہب کا معروف ذہنی رویہ ترک کر کے خصوصی انداز سے ہندومت کے افکار اور اس کے تاریخی کردار پر غور کرے۔ اس کے بعد بھی اگر گنگا جمنا کے سنگم پر کھڑا ہو تو پنڈت نہرو کی زبان میں یہی کہے گا کہ

''ہندوازم ایک عقیدہ و نظریہ کی حیثیت سے بالکل غیر واضح طور پر، بہت سی علتوں والا واقع ہوا ہے جس میں ہر شخص کو اپنی خواہش کے مطابق چیز مل جاتی ہے، اس کی تعریف کرنا ممکن ہی نہیں حتیٰ کہ حتمی طور پر یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ آیا یہ کوئی دھرم بھی ہے یا نہیں۔''

مہاتما گاندھی ہندومت کے متعلق لکھتے ہیں کہ اگر مجھے کہا جائے کہ ہندومت کی تعریف کریں، تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ اہنسا (عدم تشدد) کے ذریعہ سچائی کی تلاش کا نام ہے، ہندو دھرم سچائی کا دھرم ہے، سچائی ہی ایشور ہے۔ ایشور کے انکار سے ہم واقف ہیں لیکن سچائی کے انکار سے نہیں، گویا مہاتما گاندھی جی کے الفاظ میں اہنسا (عدم تشدد) سچائی ہے اور یہ ہے ہندو دھرم! لیکن بہت سے سچے ہندو یہ کہتے ہیں کہ اہنسا دھرم کا نام نہیں، اس لیے باقی صرف سچائی رہ گئی ہے جسے ہندو دھرم کہہ سکتے ہیں لیکن یہ کوئی تعریف نہیں ہے۔[۱۹]

اس ضمن میں بنارس یونیورسٹی کورٹ کونسل کے ممبر جناب گووند اس کی یہ رائے بالکل درست معلوم ہوتی ہے:

''ہندو دھرم کی کوئی تعریف نہیں۔ اس لیے کہ اس کی حدود ہی متعین نہیں۔ یہ دراصل علم الانسان سے متعلق تھا جسے بدقسمتی سے مذہب کا نام دے دیا گیا۔''[۲۰]

ان تمام افکار وآراء اور تعریفات کی روشنی میں یہ بڑے وثوق واعتماد سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ قدیم دور سے اب تک رائج ایسا مذہب یا نظام ہے، جس کے بانی، بنیاد، اور آثار واخبار کے متعلق کچھ مستند معلومات نہیں۔ یہ مذہب محض ایسی روایات کا مجموعہ ہے جو کسی ایک کتاب یا پیغمبر سے منسلک نہیں بلکہ اس کی کڑیاں مختلف نوع کے مذاہب سے ملتی ہیں۔

نیز لفظ ''ہندو'' ایک جغرافیائی اصطلاح ہے چنانچہ ہم ''وید'' پر ایمان لانے والوں کو بھی کسی نام سے موسوم نہیں کر سکتے ہیں۔ اگر چہ آریا برہمن دھارمک اور دیگر اصطلاحات بھی رائج ہیں۔ لیکن اس دھرم کے ماننے والوں کی کسی بھی منطقی تعریف کرنے سے قاصر ہیں۔ لہٰذا اس بات کا بھی تعین نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ہندو کون ہے اور اس کے لیے کن کن چیزوں پر ایمان واعتقاد رکھنا لازمی ہے۔ بلکہ ہندومت انسانی ذہن میں مظاہر فطرت کے متعلق پرورش پانے والے وہم سے پیدا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے متعدد خیالات ونظریات کا مجموعہ کہا جاتا ہے۔ ذیل میں یہ بھی بیان کر دوں کہ جس طرح ہندومت کی تعریف متعین کرنے میں دشواریاں ہیں اس طرح اس کی تاریخ میں بڑی الجھنیں پائی جاتی ہیں۔

ہندومت کا تاریخی جائزہ

گزشتہ صفحات میں راقم نے ہندومت کے متعلق مسلم اور ہندو مفکرین کی آراء ونظریات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندومت کا ارتقاء اور تاریخی جائزہ پیش کیا جائے۔ چنانچہ یہ بات درست ہے کہ ہمارے پاس ہندو قوم کی قدیم عہد کی مدون شدہ تاریخ موجود نہیں ہے مگر جو روایات اس ضمن میں پائی جاتی ہیں ان کو ذیل میں پیش کیا جارہا ہے چنانچہ مشہور فرانسیسی محقق ڈاکٹر لیبان اپنی کتاب 'تمدن ہند' میں لکھتا ہے:

> ''ان ہزارہا جلدوں میں جو ہندوؤں نے اپنے تین ہزار سال کے تمدن میں تصنیف کی ہیں ایک تاریخی واقعہ بھی صحت کے ساتھ درج نہیں کیا ہے، اس زمانہ میں کسی واقعہ کو پیش کرنے کے لیے ہمیں بیرونی سہاروں سے کام لینا پڑتا ہے ان کی تاریخ کتابوں میں ہر چیز کو غلط اور غیر فطری صورت میں دیکھنے کی خاصیت نہایت واضح طور پر پائی جاتی ہے اور یہ بات

ایک آدمی کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ ان کے ذہن میں کجی ہے۔ قدیم ہندوؤں کی کوئی تاریخ ہی نہیں ہے اور نہ عمارات اور یادگاروں سے اس کی تلافی ہوتی ہے۔ ہندوستان کا تاریخی زمانہ فی الواقع مسلمانوں کی فوج کشی کے بعد شروع ہوا اور ہندوستان کے پہلے مؤرخ مسلمان ہیں۔'' [۲۱]

مذکورہ اقتباس سے پتہ چلا کہ ہندوؤں کے اکابرین نے اول تو اپنے عہد کے واقعات مدون نہیں کئے اور دوسرے جو کچھ ضبط تحریر میں لایا گیا وہ اتنا مبالغہ آمیز، ابہام پر مبنی اور نا قابل فہم ہے کہ تاریخ نہیں کہلا سکتا۔ ان حالات کی روشنی میں ہندوؤں کے مذہبی عقائد و رجحانات ان کے تمدن سیاست اور معیشت کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے، اس کمزوری کا اعتراف خود پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں اس طرح کیا ہے:

''اہل چین، اہل یونان اور عربوں کے برعکس قدیم ہندوستان کے لوگ مؤرخ نہیں تھے، یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے اور اس نے یہ دشواری پیدا کر دی ہے کہ ہم گزشتہ عہد کے واقعات کا زمانہ یا تاریخ متعین کر سکیں۔ یہ واقعات کچھ اس قدر باہم خلط ملط ہوتے ہیں کہ ان سے عجیب خلفشار پیدا ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاں صرف ایک کتاب یعنی پنڈت کلہن کی ''راج ترنگنی'' ایسی ہے جسے ہم تاریخی کتاب کہہ سکتے ہیں۔ یہ کتاب کشمیر کی تاریخ ہے اور بارہویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی، باقی واقعات کے لیے ہمیں تصورات کی دنیا میں جانا پڑتا ہے۔'' [۲۲]

اس کے باوجود آثار و تاریخ جن مؤرخین نے بیان کئے ہیں ان کو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

ہندوستان کی مذہبی، معاشرتی، سماجی اور تمدنی تاریخ کو تین ادوار میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی دورِ قدیم، دورِ متوسط اور دورِ جدید۔ پہلا دور یعنی (دورِ قدیم) ابتدائی زمانہ سے شروع ہو کر آٹھویں صدی میں ختم ہوتا ہے۔ دوسرا دور (دورِ متوسط) آٹھویں صدی سے شروع ہو کر ایک ہزار برس کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ تیسرا دور (دورِ جدید) انیسویں صدی سے شروع ہو کر اب تک جاری ہے۔ پھر پہلے دور کو بھی پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے۔

۱۔ **ھجری دور:** یہ قبل از تاریخ کا دور ہے جس کے ابتدائی زمانہ کا تعین مشکل سے کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ دور آریاؤں کی آمد پر ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔ **ویدک دور:** اس کا آغاز آریاؤں کی آمد سے ہوتا ہے جو کہ ساتویں صدی قبل مسیح تک کے عرصے پر محیط ہے۔

۳۔ **بدھ دور:** یہ دوسری صدی عیسوی میں ختم ہوتا ہے

۴۔ **ابتدائی ہندو دور:** یہ تیسری صدی عیسوی میں ختم ہو جاتا ہے

۵۔ **بعد کا ھندو دور:** آٹھویں صدی عیسوی میں ختم ہوتا ہے۔[۲۳]

دوسرے (دورِ متوسط) کو بھی دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور آٹھویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر تیرہویں صدی عیسوی تک ہے، دوسرا دور تیرھویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر اٹھارویں صدی عیسوی میں ختم ہو جاتا ہے۔

تیسرا دور (دورِ جدید) بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔ اس کا پہلا دور اٹھارویں صدی میں انگریزوں کی برصغیر پاک و ہند میں آمد سے شروع ہو کر بیسویں صدی میں آزادیٔ ہند پر ختم ہوتا ہے۔ جبکہ دوسرا دور تقسیم ہند، پاکستان، بنگلہ دیش اور دوسرے ممالک کی تشکیل سے اب تک جاری ہے۔[۲۴]

مشہور مصنف اور تاریخ داں رما شنکر ترپاٹھی اپنی معروف و متداول کتاب ''تاریخ قدیم ہندوستان (مترجم سید سخی حسن نقوی) میں لکھتے ہیں:

> ''قدیم ہندوستان تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے لحاظ سے متنوع بھی ہے اور مالا مال بھی۔ لیکن تاریخی طور پر غیر معمولی طور پر ناقص اور نامکمل ہے۔ ہندی ادب میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں ہے جو کتاب سلاطین، تاریخ لیوی یا ہیرڈونس کی تواریخ کا مقابلہ کر سکے۔ اس کا سبب یا تو یہ تھا کہ لوگوں میں تاریخی ذوق کا فقدان تھا یا یہ کہ معاشرہ کے جو افراد اس کی نشو ونما میں سرگرم تھے وہ خود بے اعتنائی برت رہے تھے۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندی تہذیب و تمدن اور یہاں کی انسان کی ابتدائی معاشرتی زندگی بڑی حد تک پردۂ خفاء میں ہے۔''[۲۵]

دورِقدیم

یہ بات وثوق سے نہیں کہی جاسکتی ہے کہ سرزمین ہند پر انسانی آبادی کا آغاز کب ہوا، تاہم یہ مختلف مقامات پر کھدائی کے دوران جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندے قدیم حجری عہد کے لوگ تھے، وہ وحشی تھے اور درختوں کے نیچے یا قدرتی غاروں میں پناہ لیتے تھے، وہ زراعت کا کوئی تصور نہیں رکھتے تھے اور آگ کے روشن کرنے سے بھی پوری طرح واقف نہیں تھے۔ مٹی کے برتن اور دھاتوں کے استعمال سے بھی ناواقف تھے، وہ شکار کر کے یا قدرتی جڑی بوٹیاں کھا کر زندگی گزارتے تھے۔ ان کے امن کے زمانہ کے اوزار اور وحشی درندوں اور خوفناک آبی جانوروں سے جنگ کے لیے ہتھیار پتھر کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے ہوتے تھے جنہیں وہ بہت بے ترتیبی سے تراشتے تھے، جن میں کلہاڑیاں، بھالے، زمین کھودنے کے آلات اور پھینک کر مارنے کے گول پتھر وغیرہ شامل تھے۔ اس عہد کے لوگ اپنے مردوں کو دفن نہیں کرتے تھے بلکہ انہیں یوں ہی چھوڑ دیتے تھے۔ [۲۶]

قدیم دور کے متعلق یہ نظریہ رہا ہے کہ ماضی بعید میں ''ست یگ'' تھا۔ ایک ایسا عہد جس میں انسان اپنی زندگی اطمینان ومسرت سے گزارتا تھا اور ضروریات زندگی کی تکلیف اور زوال سے مبرہ تھا۔ [۲۷]

معاشرتی ارتقاء وتاریخ کا دوسرا دور تو حجری عہد ہے۔ اس وقت کے لوگ تہذیب وشائستگی سے کافی حد تک ہمکنار ہو گئے تھے۔ پہاڑوں کی پناہ گاہ میں گزر اوقات کر کے ساتھ ساتھ وہ اپنی رہائش ومسکن کے لیے بانس اور پھونس کی جھونپڑی بنا کر رہنے لگے تھے۔ حتیٰ کہ وہ طعام کے پکوان اور آگ کو روشن کرنا بھی سیکھ چکے تھے۔ مچھلی پکڑ کر، شکار کھیلنے اور جانوروں کو پالنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ ذریعۂ معاش کے لیے کاشت کاری کی ابتداء کھانے پینے کی اشیاء کو رکھنے کے لیے مٹی کے برتنوں کا ایجاد کرنا، اسی طرح بدن کو چھپانے کے لیے چھال یا جانوروں کی کھال سے لباس بنانا اور مردوں کی تجہیز وتدفین کا چلن بھی اس عہد سے ملتا ہے۔ [۲۸]

مذکورہ اقتباس اس بات پر شاہد عدل ہے کہ ہندوستان کی آبادی کے آغاز کا تاریخی طور پر کوئی بین ثبوت نہیں ہے، البتہ جو بھی افراد آباد تھے وہ ابتداء میں کسی بھی تہذیب اور رسم ورواج کے نہ صرف یہ

کہ علمبر دار نہ تھے بلکہ وہ یوں ہی اپنی زندگی کے اوقات کو گزارتے تھے۔اس کے بعد جوں جوں دور آگے بڑھتا گیا تو انہوں نے زندگی گزارنے کی چند چیزیں سیکھ لیں اور اس طرح سے معاشرتی ارتقاء کے مذکورہ ابتدائی نقوش ان کے اندر پائے جانے لگے۔

ہندوستان کی قدیم اقوام

یہ بڑا متضاد مسئلہ ہے کہ ہندوستان کی قدیم قوم کون ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں مفتی سید عبدالقیوم جالندھری اپنی نادر تصنیف ''منو کا قانون اور اسلامی قانون'' میں رقمطراز ہیں:

''انسان مدنی الطبع ہے، وہ انفرادی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی کو ترجیح دیتا ہے، شروع زمانہ میں بعض لوگ شکار کرنے کی غرض سے اور بعض کاشت کاری کی غرض سے اجتماعی زندگی بسر کرتے تھے، مگر وہ تعمیر کے فن سے واقف نہ تھے۔مکانوں اور عمارتوں کی بجائے جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ یہ اقوام خانہ بدوش تھیں جہاں شکار یا کاشت کی جگہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی وہاں جا کر جھونپڑیاں بنا لیتے تھے۔جب نوع انسانی نے تہذیب و تمدن میں کچھ ترقی کی تو وہ اپنی رہائش کے لیے عمارتیں تعمیر کرنے لگے۔ ہندوستان کے قدیم ترین عہد میں اس ملک میں کول، سنتال، منڈا بھیل، گونڈ و غیرہ قومیں آباد تھیں۔ یہ لوگ تعمیر کے فن سے واقف تھے مگر دھات استعمال کرنا نہیں جانتے تھے۔ ہتھیار برتن وغیرہ پتھر تراش کر بناتے تھے۔ماہرین آثار قدیمہ کی کوشش سے ۱۹۲۰ء میں سندھ کے ضلع لاڑکانہ میں ایک اونچے ٹیلے کے کھودنے سے اقوام متذکرہ صدر کا قدیم شہر موہنجوداڑو برآمد ہوا۔اس کی عمارتوں سے پتھر کے اوزار برتن وغیرہ نکلے تھے۔''[۲۹]

البتہ رماشنکر تر پاٹھی اپنی کتاب ''تاریخ قدیم ہندوستان'' میں لکھتے ہیں کہ

''دراوڑ لوگ ہندوستان کی سب سے پرانی مہذب نسل سے تعلق رکھتے

ہیں، دراوڑ قوم کے آبائی وطن کے بارے میں مؤرخین اور ماہرین کی آراء باہم مختلف ہیں۔ بعض محققین کے نزدیک دراوڑ لوگ ہندوستان کے قدیم ترین باشندوں کی اولاد تھے۔ جبکہ بعض دوسرے ماہرین کا ماننا یہ ہے کہ یہ لوگ تبت کے پلیٹو یا وسط ایشیا میں اپنے وطن مالوف توران سے یہاں آکر سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ بہرحال مغربی ایشیا کو عموماً ان کا جائے قرار تصور کیا جاتا ہے۔ جس کی ایک وجہ وہ نسلی ہم آہنگی ہے جو دراوڑی اور سمیری لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ دراوڑی قوم کی اصل جو بھی ہو، البتہ یہ بات طے ہے کہ دراوڑ ہندوستان کی آبادی کا ایک اہم عنصر تھے، شمالی ہند میں بھی اور جنوبی ہند میں بھی۔ کیونکہ ان کی زبانیں جنوبی ہند پر آج بھی چھائی ہوئی ہیں۔ نیز دراوڑی خصوصیت کا پتہ ویدوں اور کلاسیکی سنسکرت میں یا عوامی بولیوں اور ان سے نکلی ہوئی آج کل کی دیسی زبانوں میں یکساں طور پر ملتا ہے۔''[۳۰]

دراوڑی تہذیب نے وادئ سندھ کے ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں پرورش پائی۔ اس کے متعلق Sir John Marshal اپنی کتاب The Prehistoric Civilization of the India میں لکھتے ہیں:

''سندھ اور پنجاب میں پائے جانے والے یہ آثار قدیمہ تین اور چار ہزار قبل از مسیح کی تہذیب یافتہ شہری زندگی کا پتہ دیتے ہیں۔ ان آثار قدیمہ میں پائے جانے والے گھر ان کے ساتھ وابستہ کنویں، غسل خانے، پانی کے بہاؤ کا بہتر انتظام اور شہری معاشرت کی دوسری تمام سہولیات اس تہذیب کو سمیر کے کم از کم ہم پلہ اور اپنی ہم عصر بابل اور مصری تہذیبوں سے برتر معلوم ہوتے ہیں، یہاں تک کہ ''ار'' کے مکانات بھی اپنے طرز تعمیر میں موہن جوداڑو کا مقابلہ نہیں کرتے۔''[۳۱]

بالائی سطریں اس بات پر واضح دلالت کررہی ہیں کہ ہندوستان جیسے معاشرہ میں پائے

جانے والی قدیم تہذیب دراوڑ اور موہن جوداڑو بہت حد تک تہذیب وشائستگی کے زیور سے آراستہ تھی۔ رماشنکر ترپاٹھی نے لکھا ہے کہ

> ''آثار قدیمہ سے ملنے والی مہریں، تانبے کی تختیاں، دھات کی مورتیاں، مٹی کے پتلے اور پتھروں سے ان کی مذہبی زندگی کے بارے میں بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں ''ماتادیوی'' ہے اس کے علاوہ ''شیومت'' لنگ پوجا اور حیوان پرستی کی علامات بھی پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح مردوں کی تجہیز وتدفین کے بارے میں بھی تین طریقوں کا سراغ ملتا ہے۔ جن میں باقاعدہ طور پر دفنانا، چرندوں اور پرندوں کی نذر کرنا اور جلا کر دفنانے کا طریقہ شامل تھا۔ جبکہ سماجی طور پر عورت کو سربراہی حاصل تھی۔''[۳۲]

ول ڈیورانٹ نے اپنی کتاب، تاریخ، تہذیب، تمدن، فلسفہ ہندوستان (مترجم طیب رشید) میں بڑی عمدہ بات لکھی ہے:

> ''آریاؤں کا دیہی سماجی نظام، کاشت کاری اور محصولات کے طریقے دراوڑی تہذیب سے ماخوذ ہیں چونکہ یہ لوگ زیادہ تر دریائے سندھ کے کنارے سکونت پذیر تھے اس لیے ان کو سندھو کہا جاتا ہے۔ بعد میں 'س' 'ہ' سے بدل کر ہندو ہوگیا گویا۔ اس پورے علاقہ کا نام ہندوستان پڑ گیا۔''[۳۳]

موہن جوداڑو اور ہڑپا کی عظیم تہذیب کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا، یہ تہذیبیں کیوں زوال پذیر ہوئیں، اس بارے میں ساری تاریخ خاموش ہے۔ البتہ بعض مؤرخین اسے قدرتی آفت یا بیرونی حملہ قرار دیتے ہیں۔ ہاں ہند کے طول وعرض سے دریافت ہونے والے شواہد کی بدولت ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ آریا قوم سے انکا کوئی قابل ذکر تعلق نہیں تھا اور اس وقت ہندوستان ایک آباد سرزمین بن چکی تھی۔

دراوڑی قوم میں مذہب شناسی

ایشوراٹو پا اپنی معروف تصنیف ہندوستانی تمدن میں دراوڑی قوم کے مذہبی شعور کے بارے

میں رقم طراز ہیں:

''موہنجوداڑو کی کھدائیاں ان کے مذہبی عقیدوں پر بھی روشنی ڈالتی ہیں لیکن ابھی تک ماہرین ان کے مذہبی تخیلات کو صحیح طور پر سمجھنے سے قاصر ہیں۔ہم ابھی تک صرف اتنا جان سکے کہ ان لوگوں کے عقیدے ابتدائی قوموں کے عقیدوں جیسے تھے۔اس زمانہ کی دنیا میں درختوں کی پرستش بحیثیت حیاتِ شجر عام تھی۔مصر میں بھی اس قسم کا عقیدہ تھا۔موہن جوداڑو کے لوگ بھی اس پر یقین رکھتے تھے۔ پتھروں میں دیوی اور دیوتاؤں کو مانتے تھے۔شیوجیسی ہستی کی بھی وہ پرستش کرتے تھے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ قوت الٰہی کی نشانی تھی۔یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ یوگ کے طریقوں سے واقف تھے۔مہامائی ان کی عام دیوی تھی جس نے آگے چل کر اپنا تسلط ہندواسیوں کی عقیدتوں پر جما لیا تھا۔یعنی آج کے دن بھی ہندوستان کے ہزار ہا گاؤں میں یہ دیوی مختلف شکلوں میں پوجی جاتی ہے۔''[۳۴]

مذکورہ اقتباس کی روشنی میں یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ دراوڑی قوم میں مذہبی شعور موجود تھا اور وہ ان مذہبی رسوم کو اپنے طور پر ادا کرتے تھے۔

دراوڑی کلچر و ثقافت

مصنف اس قوم کی تہذیب و ثقافت اور کلچر کے متعلق لکھتا ہے:

''یہ کھدائیاں اس امر کی شاہد ہیں کہ دراوڑی لوگ اس زمانے میں شہروں کے بسانے کے تمام اصولوں سے واقف تھے۔ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ لوگوں کی زندگیوں کا تعلق بحیثیت شہری کن اہم اصولوں سے ہونا چاہئے۔ ٹاؤن پلاننگ (شہر بسائی) کے اصولوں سے وہ ناواقف نہ تھے۔ بلکہ ان کے مکانوں اور شہر کا نقشہ دیکھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے شہر کو صاف ستھرا رکھنے،صفائی کی آسانیاں بہم پہچانے ،اور حفظانِ صحت کے

اصول کو بھی مدِ نظر رکھنے کا خاص اہتمام کیا تھا۔ان کے شہروں کی سڑکیں
کشادہ ہوتی تھیں اور صفائی کا ان کو بے حد خیال تھا۔ان کے مکان ایک
یا دومنزلہ بھی ہوتے تھے۔مکانوں کی تعمیر آگ میں پکی ہوئی اینٹوں سے کی
جاتی تھی۔استرکاری چونے سے ہوتی تھی۔ان کے مکانوں کی بنیاد دیکھ
کر تعجب ہوتا ہے کیونکہ وہ بے حد پختہ تھی۔"[۳۵]

دراوڑی قوم کا سیاسی نظام

دراوڑی قوم میں جہاں دیگر تہذیبیں موجود تھیں وہیں ان میں سیاسی نظم ونسق کا بھی تصور پایا جاتا تھا، چنانچہ ایشوراٹوپا نے ہندوستانی تمدن میں تحریر کیا ہے:

"رگ وید کی شہادت کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دراوڑیوں نے بڑی بڑی
سلطنتیں قائم کی تھیں، ان میں سیاسی نظم ونسق بھی موجود تھا، حکومت تنظیمی
حالت میں تھی، سب سے بڑھ کر یہ کہ ان لوگوں کی اعلیٰ تہذیبی زندگی کا
نقشہ ہڑپا اور موہنجوداڑو کی کھدائیوں نے بڑی وضاحت سے ہمارے
سامنے پیش کر دیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ سیاسی تنظیم کے علاوہ انہوں
نے تہذیب وتمدن کو ایک اعلیٰ معیار تک پہنچا دیا تھا۔ماہرینِ انسانیات نے
ہر پہلو سے ان کھدائیوں کی جانچ پڑتال کی ہے۔دراوڑی قوم کی
معاشرت، ان کے رہنے سہنے کے طریقوں، ان کے مذہب، اور ان کے
عقیدوں، ان کے رسم ورواج، ان کی بولی، ان کی صنعتی اور زراعتی زندگی،
ان کے کھیل اور مشغلوں پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے اور روز بروز دراوڑی
زندگی کے راز نئی تحقیقات کی روشنی میں کھلتے جا رہے ہیں۔"[۳۶]

دراوڑی قوم میں فن تعمیر کا شوق

دراوڑی قوم کا اپنے رہنے سہنے کے لیے باقاعدہ مکان تعمیر کرتی تھی، ان کی عمارتیں پختہ

اور منظّم ہوتی تھیں، ان کے مکانات میں دیگر آرام دہ اشیاء کا بھی نظم ہوتا تھا،اس سلسلہ میں ہندوستانی تمدن سے درج ذیل اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''موہن جوداڑو کے لوگوں کی طبیعت میں سادگی تھی،اسی وجہ سے ان کے مکان سادہ وضع قطع کے ہوتے تھے۔لیکن رہنے سہنے کے اعتبار سے وہ خاصے آرام دہ تھے۔تقریباً ہر مکان میں کواں ہوتا تھا۔ان کے غسل خانوں میں پانی گرم کرنے کا انتظام تھا۔پانی نل کے ذریعہ سے حمام میں آتا تھا۔مکان کے باہر نالیاں بڑی اہتمام سے بنائی جاتی تھیں تاکہ مکانوں کا گندہ پانی گلیوں میں جمع ہوکر شہر کی فضا کو غلیظ نہ کرسکے۔گلیوں میں کوڑہ خانے بلدیہ کی طرف سے رکھے جاتے تھے تاکہ کوڑہ اور میل گلیوں میں دکھائی نہ دے۔شہر میں عام غسل خانے بھی تھے جن کی اصلی غایت پورے طور پر معلوم نہ ہوسکی کہ آیا یہ غسل خانے عوام کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بنائے گئے تھے یا ان کا کوئی مذہبی مقصد تھا۔لیکن اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو جسمانی صفائی کا بے حد خیال تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ شہر کی صفائی بھی ان کے پیش نظر تھی۔

موہن جوداڑو کے لوگوں کا مقابلہ اس زمانے کے متمدن ملکوں کے مکانوں سے کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسے اچھے مکان ہندوستان میں اس زمانے میں بنائے جاتے تھے جو دنیا کے کسی حصہ میں نہیں بنے تھے۔یہاں کی فنِ تعمیر کاری کا معیار بہت بلند تھا۔موہن جوداڑو میں دوسری قسم کی بھی عمارتیں بہت سی ملی ہیں جن کی غرض وغایت سمجھ میں نہیں آتی۔ممکن ہے کہ یہ عمارتیں مذہبی رسموں کی ادائیگی کے لیے تیار کی گئی ہوں۔''[۳۷]

ذریعۂ معاش

جس طرح دیگر مہذب اور تہذیب یافتہ اقوام میں ذریعۂ معاش کا تصور پایا جاتا ہے،اس

طرح دراوڑی قوم کے یہاں معاش کو حاصل کرنے کے ذرائع پائے جاتے تھے۔

''انہیں کھدائیوں کے ذریعہ ہمیں موہن جوداڑو کے لوگوں کے پیشوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ وہ لوگ زیادہ تر زراعت پیشہ تھے لیکن شہری لوگ مختلف صنعتی پیشے انجام دیتے تھے۔ تقریباً ہر گھر میں سوت کاتا جاتا تھا کیونکہ ہر گھر سے تکلیاں برآمد ہوئی ہیں۔ امیر وغریب سب کے سب کاتنے کے ہنر سے واقف تھے۔ کپڑا بھی گھر گھر بنایا جاتا تھا۔ سوتی اور اونی دونوں قسم کا کپڑا وہ پہنتے تھے۔ ان کے لباس کی وضع قطع آج کے ہندوستانی لباس کی وضع قطع سے بالکل جداگانہ تھی۔ ان لوگوں کا لباس بہت ہی مختصر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لباس جسم کو ڈھانکنے کا کام دیتا تھا، نہ کہ اس سے جسم کی زیبائش مقصود تھی۔ عورت اور مرد کے لباس میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ امیر اور غریب کے لباس میں وضع قطع کے لحاظ سے زیادہ فرق نہ تھا۔''[۳۸]

دراوڑی قوم کی تزئین وآرائش

'ہندوستانی تمدن' کے مصنف نے اس بابت درج ذیل باتیں تحریر کی ہیں:

''گو لباس سادہ تھا لیکن زیورات پہننے کا سب کو خواہ امیر ہو یا غریب، عورت ہو یا مرد، بے حد شوق تھا۔ چنانچہ ان کھدائیوں میں کثرت سے زیور نکلے ہیں۔ یہ زیور تقریباً اسی قسم کے ہیں جو ہندوستان میں ہمیشہ سے مروج رہے ہیں۔ مختلف دھاتوں یا قیمتی پتھروں سے زیور بنائے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ہڈی اور مٹی کے بھی زیور ملے ہیں۔ ان کو دیکھ کر موہن جوداڑو کے لوگوں کی خوش حالی اور ان کی خوش مذاقی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔''[۳۹]

استعمال کے لیے برتن

اس طرح دراوڑی قوم میں کھانا کھانے یا دیگر اشیاء اکل وشرب کے لیے برتنوں کا استعمال

ہوتا تھا:

''ان کے گھروں میں مختلف دھاتوں کے بنے ہوئے برتنوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔مٹی کے برتن بھی کثرت سے دستیاب ہوئے ہیں جن پر رنگین نقش کاری بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔اس نقش کاری سے ان کے فنی ذوق کا اندازہ لگتا ہے۔غذا میں دودھ،دہی،اناج اور ترکاری کے علاوہ جانوروں کا گوشت بھی وہ کھاتے تھے۔جانوروں سے ان کو بڑی ہمدردی معلوم ہوتی ہے۔وہ ان کو پالتے بھی تھے اور ان سے مختلف قسم کا کام بھی لیتے تھے۔ہتھیاروں کے بنانے کے طریقے ان کو معلوم تھے اور ہتھیار بھی رکھتے تھے۔''[۴۰]

دیگر ممالک سے تعلقات

'ہندوستانی تمدن' کے مصنف نے لکھا ہے کہ دراوڑی قوم کے دیگر ممالک سے مختلف نوعیت کے تعلقات تھے:

''یہ کھدائیاں ہم کو یہ بھی بتاتی ہیں کہ موہن جوداڑو کے لوگوں نے مختلف نوعیّتوں کے تعلقات بھی دوسرے ملکوں سے قائم کئے تھے۔یہ بتانا بے حد مشکل ہے کہ موہن جوداڑو کے لوگوں پر بیرونی تہذیب کے اثرات کیا پڑے تھے لیکن اتنا کہا جا سکتا ہے کہ دوسرے ملکوں کے مذہبی رسوم یہاں کے لوگوں کے رسوم سے ملتے جلتے تھے۔یہاں کا تہذیبی اور تمدنی معیار دوسروں کے مقابلہ میں اعلیٰ اور بلند تر تھا۔کوئی تعجب نہیں کہ موہن جوداڑو کے لوگوں نے اپنا اثر ہندوستان کے باہر بھی چھوڑا ہوگا۔اس زمانہ میں اچھے خاصے تجارتی تعلقات اس ملک نے دوسرے ملکوں سے قائم کر لیے تھے۔دوسرے ملکوں میں ان کا آنا جانا برابر جاری تھا۔یہ کھدائیاں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ ہمارے ملک نے دنیا سے علیحدہ رہ کر زندگی بسر نہیں کی تھی۔''[۴۱]

ہندوستان میں آریہ قوم کی آمد

ماہرین ومؤرخین کی رائے یہ ہے کہ ہندوتہذیب وثقافت کا دورثانی آریاؤں کی آمد سے شروع ہوتا ہے، اوراس کومؤرخین اس طرح تقسیم کرتے ہیں، پہلا دور، دوہزار قبل مسیح سے لیکرایک ہزار قبل مسیح پر محیط ہے۔''آریہ''(سنسکرت زبان میں''شریف النفس'' کوکہتے ہیں،اس کے آبائی وطن کے بارے میں مؤرخین کی حتمی رائے نہیں ہے،اکثر مؤرخین کا خیال ہے کہ ان کا اصلی وطن دائرہ قطب شمالی یاباختر(موجودہ افغانستان کے بلخ کا علاقہ) یا پامیر تھا۔علاوہ ازیں ہندی آریہ کو''اوستا'' کے دور کے ایرانی قدیم ہندی جرمنوں (ہندی یورپین) کی ایک شاخ تصور کیا جاتا ہے۔[۴۲]

خواجہ حسن نظامی دہلوی اپنی مشہور تصنیف کرشن بیتی (بعد میں اس کا نام کرشن جیون رکھا گیا ہے) کے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں کہ

> ''اس زمانہ کی تاریخ رگ وید سے معلوم ہوتی ہے عیسیٰ سے تقریباً دوہزار سال پیشتر ایک قوم ہند میں آئی ،جنکی جلد سفید اور بال سیاہ تھے یہ قوم ایک ہی زبان بولتی تھی جس کا نام آریک تھا، یہ اصلی زبان تو مفقود ہوگئی ہے لیکن سنسکرت اسی سے مشتق ہے یہ قوم کابل (افغانستان) کے دروں سے ہوکر ہندوستان میں آئی اوراطراف واکناف میں پھیل گئی، یہ خانہ بدوش تھی، اسے فن زراعت کا علم تھا اور اکثر اقوام کی ابتدائی حالت کی طرح ان کا متخیلہ نہایت ہی زوردارتھا۔آریہ قومیں دریائے سندھ سے گنگا تک آئیں اوراس کے بعد برہم پترتک پھیل گئیں، راہ میں انہوں نے سیاہ فام اورسیدھے بال والی اقوام اورتورانیوں کوجوان سے پہلے یہاں مقیم تھے زیرکیا اور بتدریج ہند کی سرزمین پربس گئیں۔ جب وہ ہندوستان میں وارد ہوئیں۔''[۴۳]

اس کے علاوہ رگوید میں دریائے سندھ اوران کے معاون دریاوتستا (جہلم)اسکن (چناب) پروشنی (راوی) ستدری (ستلج)اورگنگا جمنا کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ آریہ ان دریاؤں سے سیراب

ہونے والے تمام علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔[۴۴]

آریہ قوم کا مذہب

آریہ قوم کی ہندوستان میں آمد کے اسباب جاننے کے بعد یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ اس قوم کا مذہب کیا تھا، چنانچہ آریائی قوم کے متعلق ہندو مذہب کا مقدس نوشتہ رگوید یہ بیان کرتا ہے:

> ''آریا قوم بھی ابتداء میں موحد تھی اور ان کا مذہب توحید پر استوار تھا۔ بت پرستی یا مظاہر پرستی جیسی کوئی رسم یا نظریہ ان میں نہیں تھا۔ البتہ جس دور میں آریا ہندوستان میں داخل ہوئے تھے، تب تک وہ عقیدہ توحید سے محروم ہو چکے تھے اور کئی دیوتاؤں کی پرستش کرنا ان کا دین تھا اور ہندوستان کی مقامی قوم کی طرح انکا مذہب بھی آباؤ اجداد اور دیوتاؤں کا پرستار بن چکا تھا۔ اس وقت ان کا دیوتا ''اندر'' تھا جو تمام روحوں کا سردار تھا۔ البتہ ان کے مذہب میں موجودہ ہندومت کی طرح اتنی پیچیدگیاں نہیں تھیں بلکہ دیوتاؤں کی تعداد کے باوجود یہ ایک سادہ مذہب تھا۔''[۴۵]

آریہ قوم کی معاشرتی تہذیب

دراوڑی قوم (جنہیں ویدوں میں 'داسیوں' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے) کی تہذیب کے خاتمہ کے بعد آریاؤں کی ابتدائی زندگی کافی دشوار تھی۔ وہ ازدواجی زندگی کے لیے شادی کے بندھنوں کو مضبوط رکھتے اور انہیں مقدس سمجھتے تھے۔ عام طور پر ایک شادی کے اصول کی پابندی کرتے تھے۔ تاہم کہیں کہیں کثرت ازدواج کا رواج بھی موجود تھا۔ چند شوہری اور بچپن کی شادی کے آثار نہیں ملتے ہیں البتہ بعد کے دور میں کثیر شوہری کا رواج بھی موجود تھا۔ اس سلسلہ میں 'دردپدی' نامی عورت مشہور ہے جو ایک ہی وقت میں پانچ سگے بھائیوں کی اکلوتی بیوی تھی۔ اس طرح خواتین اپنے شوہروں کے انتخاب میں کافی حد تک آزاد تھیں۔ وہ گھریلو زندگی میں پورا اختیار رکھتی تھیں اور شوخ لباس اور زیورات پہن کر قربانیوں اور دیگر رسومات میں شرکت کرتی تھیں۔ خواتین کو علیحدہ رکھنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ اور نہ خواتین

کی نقل وحرکت پر کوئی پابندی تھی۔عورتیں تعلیم یافتہ ہوتی تھیں۔''گھارگی'' نامی خاتون علم فلسفہ کی ماہر تھی۔اس طرح رگوید کے بعض منتر بھی عورتوں کی طرف منسوب ہیں۔مردوخاتون کے علاوہ کنبہ میں دوسرے افراد بھی شامل ہوتے تھے یعنی والدین بہن بھائی اور بیٹے وبیٹیاں وغیرہ عموماً کنبہ کے باہمی تعلقات میں خلوص ووفا اور باہمی تعاون کا جذبہ پایا جاتا تھا۔اس کے علاوہ کہیں کہیں زمین، جانور اور زیورات کی وجہ سے تنازعات اور رنجشیں پیدا ہوتی تھیں جس سے کنبہ ٹوٹ کر منتشر ہوجاتا تھا۔[۴۶]

آریہ قوم کا ذریعہ معاش

مؤرخین نے لکھاہے کہ آریا قوم کا ذریعۂ معاش جانوروں کا پالنا تھا۔وہ بڑی تعداد میں گائیں پالتے تھے اوراسی پر ان کی دولت اور خوشحالی منحصر تھی۔اسے وہ اپنی فلاح وبہبود کا حاصل سمجھتے تھے۔ان کے پالتو جانوروں میں گھوڑا، بھیڑ، بکری کتا اور گدھا وغیرہ شامل تھے۔اس کے علاوہ آریوں کا ذریعۂ معاش زراعت وکاشت کاری بھی تھا۔معلوم ہوتاہے کہ ہل چلانے کے وہ پہلے سے عادی تھے جس میں بیل جوتے جاتے تھے۔اناج جب پک جاتا تو درانتی سے کاٹا جاتا، پھر گہائی ہوتی، پھر ہوامیں بھوسا اڑا کر غلہ صاف کرنے کے بعد گوداموں میں محفوظ کردیا جاتا تھا۔اس کے علاوہ آریہ قوم ذریعۂ معاش کے لیے شکار کا بھی شوق رکھتی تھی۔پرندوں اور جانوروں کو جال میں پھانستے تھے یا بعض اوقات تیر کمان سے ان کا شکار کرتے تھے۔ہرن شیر اور دوسرے جانوروں کو پکڑنے کے لیے وہ گڑھے کھودتے تھے۔[۴۷]

آریہ قوم نہایت سادہ تھی۔بھیڑ کی اون کا سادہ لباس پہنتے تھے۔غذا میں گوشت اور ترکاریاں دونوں کا استعمال کرتے تھے۔گوشت کا کھانا ممنوع نہیں تھا لیکن گائے کو اس سے پہنچنے والے فوائد کے خیال سے ''اگھنیا'' ناقابل ذبیحہ سمجھا جاتا تھا۔دودھ دہی اور گھی بھی غذا کے طور پر استعمال کرتے تھے۔مشروبات میں دودھ اور پانی کے علاوہ شراب بھی پیتے تھے جبکہ مذہبی رسومات میں ''سوم'' ان کا بڑا مرغوب مشروب تھا۔[۴۸]

آریا قوم کا سیاسی نظام

سیاسی تنظیم میں کنبہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی جو کہ ویدی ریاست کی بنیاد تھی۔کئی کئی کنبوں

سے جو برادری کے بندھنوں میں منسلک ہوتے تھے مل کر گرام (گاؤں) بنتا تھا اور کئی گراموں سے مل کر 'وِش' (ضلع) بنتا تھا اور کئی وشوں سے مل کر جَنْ یا قبیلہ کی تشکیل ہوتی تھی۔ پورا قبیلہ ایک سردار یا راجن کے ماتحت ہوتا تھا۔ جو اکثر موروثی ہوتا تھا۔ کبھی کبھا 'روش' کے لوگ راجن کا انتخاب بھی کرتے تھے لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ یہ انتخاب حکمراں جماعت تک محدود ہوتا تھا یا دوسرے شریف خاندانوں سے بھی راجن کو چنا جا سکتا تھا۔ ٹیکس کا کوئی نظام نہیں تھا، جنگ کے وقت ضرورت پڑنے پر لوگوں سے مالی اعانت کی اپیل کی جاتی تھی۔ راجہ مکمل طور پر خودمختار اور مطلق العنان نہیں ہوتا تھا۔ اس کے اختیارات کا دارومدار رعایا کی مرضی پر ہوتا تھا۔ جس کا اظہار سبھا (کونسل یا اسمبلی) اور سمیتی (کل جنتا کی اسمبلی) میں ہوتا تھا۔ [۴۹]

آریہ قوم کا خوشی کے اظہار کا طریقہ

آریہ قوم خوشی کے موقع پر ناچ گانا کرتی تھی جس میں مرد اور خواتین دونوں شامل ہوتے تھے۔ آلات موسیقی میں ڈھول، جھانج، ستار اور بانسری وغیرہ شامل تھے ان کا مذہب ''مظاہر پرستی'' تک محدود تھا جن میں ارضی دیوتا، پرتھوی، سوم، اگنی، فضائی دیوتا جیسے اندر، وایو، ترت، پرہنا اور سماوی دیوتا جیسے ورن، دیاوس، اشون، سوریہ، سوتری اور وشنو کی پوجا کی جاتی تھی۔ [۵۰]

مذکورہ شواہد کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آریہ قوم میں زندگی گزارنے کا پورا نظام موجود تھا اور وہ زندگی میں اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ کسی بھی مہذب معاشرہ کے لیے جو اصول وضوابط ہوتے ہیں وہ ان میں بھی موجود تھے اگرچہ ان کی بودوباش اور رہن سہن کافی حد تک ممتاز تھی۔ ہاں یہ کہنا درست ہے کہ آریہ قوم تہذیب وشائستگی کے زیور سے شدبد رکھتی تھی۔

ویدی عہد کا آخری دور

ویدی عہد کے آخری دور کو آریوں کے دریائے گنگا اور جمنا میں آباد ہونے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ہندوؤں کی مقدس کتابیں ویدک تعلیمات کے فروغ پر مبنی ہیں۔ ہندو دینیات ان کتابوں سے منسوب ہے جس کا عرصہ ہندوستان میں آریوں کے فتوحات کے بعد یعنی ۱۵۰۰ قبل مسیح سے لیکر ۶۰۰ قبل مسیح تک رہا ہے۔ اس زمانہ کے آتے آتے آریہ اور ہندوستان کی مقامی مذہبی روایات

آپس میں گڈمڈ ہوچکی تھیں۔ پارسی مذہب سے زنگ آلودہ، ویاس جی کی مرتب کردہ وید اوراس کی تعلیمات لوگوں نے خوش دلی سے قبول کر لی تھیں۔ مذہبی رسومات پیچیدہ ہوتی جارہی تھیں اوران پرایک خاص طبقے (برہمن) کی اجارہ داری قائم ہوگئی تھی جنہوں نے خود کو تمام لوگوں سے افضل قرار دے دیا تھا۔عوام برہمن طبقہ کی اجارہ داری اورتحریفات کی وجہ سے قدیم مناجاتوں کو بھول گئی تھی۔سنسکرت زبان کی نشوونما بھی اس دور میں کی گئی مذہب میں تبدیلیاں ہورہی تھیں۔

عقائد کے اعتبار سے اس دور میں عوام الناس کے ذہنوں کو یونانی فلسفے نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ فلسفیانہ کتابیں مثلاً 'اپنشد' بھی اس دور کا تحفہ مانا جاتا ہے۔ جو دراصل اس وقت کے درویشوں کے غوروخوض کا ثمر تھیں۔ تارک الدنیا لوگ جنگل میں رہتے تھے۔ نئے نئے آنے والے لوگ ان کی شاگردی اختیار کر لیتے تھے۔ انہی شاگردوں نے اپنے راہب استاذوں کی تعلیمات جمع کر کے اپنشد تدوین کی۔ دورِجدید کے فلسفیانہ نظام کی طرح اس وقت بھی خدا کو انسان کی ''انا'' بتلایا گیا اوراخلاقی تدوین کو نہایت دقیق طریقے سے سمجھایا گیا، بدقسمتی، تکالیف، مصائب اور نچلی ذات میں پیدا ہونے کے بارے میں خدا سے کوئی شکایت کے بجائے اسکو انصاف پسند ٹھہراتے ہوئے آواگون اورکرم کا عقیدہ بھی اپنشد میں بڑی شدومد کے ساتھ بیان کیا گیا۔غوروفکر کے غالب رجحان کے نتیجے میں کئی مذہبی تحریکیں اس دور میں اٹھیں۔ سیاسی اعتبار سے اس دور میں گزشتہ ادوار کی نسبت بڑی سلطنتیں قائم ہوچکی تھیں۔ جن میں سے ایک کوروَ بھی تھے۔مخصوص مہارت حاصل کرنے کے نتیجے میں پیشے موروثی ہو چکے تھے اور پشتوں کے لحاظ سے طبقاتی نظام رائج ہو چکا تھا۔ مذہبی پیشوا برہمن کہلانے لگے۔ جنگ کرنے والے اور ملک کے سیاسی معاملات کو سنبھالنے والے چھتری کہلائے اور زراعت وتجارت سے وابستہ لوگ ویش کہلائے۔ مقامی قوم یعنی دراوڑ (داس) شودر کہلائے۔ [۵۱]

برہمنی عہد کا خاتمہ

برہمنی عہد کے خاتمہ سے لے کر ۴۰۰ء عیسوی تک کے دور کو ہم رزمیہ نظموں یا مہابھارت اور رامائن کے زمانہ کا نام دیتے ہیں۔اس زمانہ کا واقعہ ہے کہ جب ہندوؤں کے مذہبی گروہ برہمنوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ جین مت اور بدھ مت تیزی سے لوگوں میں رواج پا رہا ہے تو انہوں نے

اپنے مذہب کی از سرِ نوتعمیر شروع کی۔ اور مذہب کے دائرہ کو وسیع کیا۔ نیز مہابھارت اور رامائن کو بھی اسی دور میں ترتیب دیا گیا تا کہ عوام کے سامنے دیوتاؤں کے کارناموں کو خوبصورت انداز میں پیش کیا جا سکے اور انہیں اپنے قدیم برہمنیت کی طرف دوبارہ مائل کیا جا سکے۔ حتی کہ برہمنوں نے ہندودھرم کی نئی تعمیر میں عوام میں مقبول دیوتاؤں کو نظر انداز نہیں کیا۔ ویدجن کو نچلے طبقے کے دیوتا اور جن میں شخصیت کے خدوخال موجود تھے انہیں نمایاں کیا گیا ''اندر'' جو کہ ویدک عہد میں سب سے عظیم دیوتا تھا اس کی اہمیت البتہ گھٹتی گئی اور اس کی اہمیت صرف دیوتاؤں کے راجہ کی رہ گئی۔ برہما کی بھی اہمیت گھٹتی گئی اور عوام میں 'وشنومت' اور 'شیومت' وجود میں آئے۔ اسی طرح نئے دیوتا میں 'گنیش'، 'درگا' بھی شامل تھے۔ اس دور میں جس طرح دیوتاؤں کی تعداد بڑھتی گئی اس سے یہ قیاس لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا عقیدہ بھی اسی دور میں مقبول ہوا ہوگا۔ دراصل یہ وہ دور تھا جب ہندومت کے جدید عقائد کی بنیاد کھڑی کی گئی۔ مظاہر فطرت کو چھوڑ کر بت پرستی کو خاص اہمیت دی گئی۔ [۵۲]

اس کے بعد والے دور کو ہندودھرم کے جدید دور سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس دور میں ۳۰۰ء عیسوی سے ۷۰۰ء عیسوی تک کا عہد مانا گیا ہے۔ اس دور کو برہنوں کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں مصوری، مجسمہ سازی، فن تعمیر جیسی صنعتیں ایجاد ہوئیں۔ ادھر مہاتما بدھ نے ہندوستان میں اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی حتی کہ آٹھویں صدی تک بدھ مت پورے ہندوستان میں پہنچ چکا تھا لیکن مہر کل بادشاہ اور (رزمیہ کے عہد کے) بعد شنکراچاریہ (۸۲۰) نے بدھ مت کی بیخ کنی کرنے اور اپنے برہمنیت کو رائج کرنے کے لیے کئی اقدامات کئے تھے۔ اپنے مذہب (ہندومت) کا احیا کرنے کے ساتھ ساتھ بدھ ازم کے ماننے والوں پر ظلم وستم کئے گئے۔ اس طرح انہوں نے اپنے مذہب کی کھوئی ہوئی ساخت ہندوستان میں دوبارہ قائم کی۔ بدھ مت کو ہندوستان سے باہر کر دیا گیا لیکن بدھ تہذیب کے جو اثرات ہندودھرم پر مرتب ہوئے انہیں زائل کرنا آسان کام نہیں تھا۔ [۵۳]

موجودہ ہندودھرم

موجودہ ہندودھرم کے متعلق 'تمدن ہند' کے مصنف کی زبان میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

''ہندومذہب کی بے انتہا قسمیں ہیں اور انمیں روز بروز تغیرات ہوتے

رہتے ہیں۔ان میں کوئی مستقل اور قائم نہیں ہے لیکن ہر ایک خود کو وید سے مشتق بتاتا ہے۔ان سب کا مجموعی نام برہمن مذہب یا ہندو مذہب ہے۔ لیکن ان کی اقسام و تعداد اس قدر ہیں جتنے کسی درخت کے پتے۔ان سب کا رجحان توحید کی طرف ہے۔اس کے باوجود انمیں ہزار دیوتا ہیں اور اکثر پتھر کے بت اور لکڑی کی پتلیاں بھی شامل ہیں۔ ہر ایک میں سے نہایت ہی پراسرار اور دقیق فلسفہ سامنے آیا ہے۔اگر ان سب مذاہب کا بیان مجموعی طور پر کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ قدیم برہمنی مذہب کے دیوتا ہیں۔ یہ وہ اجرام سماوی اور قوائے فطری ہیں جن کی پرستش وید میں ہے اور جن کو برہمنوں نے علیحدہ علیحدہ خدا بنالیا ہے''۔ [۵۴]

ہندومت کا مقدس دینی ادب

ہندومت کے مصادر و کتب کا مطالعہ بہت ہی دقت طلب ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام سرمایہ سنسکرت زبان میں ہے اور اب اس زبان کے جاننے والوں کی تعداد کم ہے۔زیادہ تر تراجم پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ ہندو مذہبی تصنیفات میں اب بھی بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو اب نابود ہیں اور نہ ہی ان کے جدید تراجم موجود ہیں۔ مثلاً تبرو مرئی، تبروشاگم، سندرو مورتی وغیرہ۔اب جو سرمایہ موجود ہے اس کو علماء ہنود، چھے اقسام میں تقسیم کرتے ہیں: (۱) شروتی (۲) سمرتی (۳) اتہاس (۴) پران (۵) آگم (۶) درشن۔

ان چھ حصے کی کتب کی بنیاد شروتی اور سمرتی پر ہے اور تمام مصادر کو ان میں سے کسی ایک زمرے میں ضرور شامل کیا جاتا ہے۔

شروتی اور سمرتی کا مفہوم

شروتی کے لفظی معنی 'جسے سنا جائے'، اس میں ویدک ادب شامل ہوتا ہے۔اس زمرے کی کتابوں کو علماء ہنود الہامی قرار دیتے ہیں: سمرتی کے معنی جسے 'یاد کیا جائے'' شروتی کے بعد ہندو علماء سمرتی

ادب کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کتابوں کو علماء ہنود مجموعی طور پر دھرم شاستر بھی کہتے ہیں۔ یہ تصنیفات ہندو دھرم کے قانون، رسوم ورواج تاریخ وروایات پر مبنی ہیں اور انتہائی تقدس کی حامل ہیں۔ ان سمرتی کتابوں میں منو دھرم شاستر، پران، گیتا، رامائن مہابھارت اور ارتھ شاستر وغیرہ شامل ہیں۔

وید کا مفہوم اور تعداد

ماہرین لسانیات کے مطابق 'وید'، 'ودیا' سے ماخوذ ہیں جس کے معنی ہیں جاننا علم اس کا ایک اور معنی بتایا گیا ہے معنی، بچانا اور غور کرنا۔[۵۵]

البتہ وید بھی جاننے اور حاصل کرنے یا غور وفکر کرنے کو کہا جاتا ہے۔ ویدی مضامین میں یہ تمام چیزیں شامل ہیں۔

اصطلاح میں وید کے معنی جاننا ہے۔ ویدوں کے متعلق علماء ہنود کی رائے یہ ہے کہ یہ ایشور کی طرف سے نازل کی گئی کتابیں ہیں۔ اسی طرح ہندو مذہبی ادبیات میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ اولاً ایک ہی وید تھا بعد میں براشٹر کے بیٹے 'ویاس نامی' شخص نے لوگوں کی سہولت کے لیے اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ اب سمہتا یعنی مجموعی وید چار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ رگ وید، سام وید، یجر وید، اتھر وید۔

اس تقسیم کے علاوہ بھی ہندو مفکرین واسکالر کے مابین یہ اختلاف ہے کہ ویدوں کی تعداد کتنی ہے۔ چنانچہ وید کے ہی ایک حصے اپنشد کے ادھیائے۴: کھنڈ ۱۷: منتر ۱۲/ اور مقدس فقہی کتاب منو دھرم شاستر ادھیائے ۱: شلوک ۲۳ کے مطابق وید تین ہیں۔ پتنجلی کی مہابھاشیہ کے مطابق وید کی تعداد ۱۱۳۱ تھی۔ اس کے علاوہ بعض ہندو علماء کا کہنا ہے کہ وید پانچ ہیں۔ ان تضادات کو رفع کرنے کے لیے 'وشنو پران' میں ویدوں کی تعداد سے متعلق کہا گیا ہے کہ وید ابتدا میں ایک ہی تھا جس میں ایک لاکھ منتر تھے۔ اس کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ اور پھر مختلف ادوار میں اس کی تدوین وترتیب کا عمل ہوتا رہا۔ اس صداقت کو سورج نارائن نے اپنی کتاب اپنشد کی تشریح میں لکھا ہے۔ ''روایت یہ ہے کہ وید ایک تھا، ویاس مہاراج نے اسے چار حصوں میں منقسم کرکے اپنے چار شاگردوں کو پڑھایا: ان شاگردوں کے اور شاگرد ہوئے اور ان کے بھی اور اس طرح شاخیں پھیلتی گئیں۔''[۵۶]

ویدوں کے متعلق علماء کی آراء

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ وید الہامی ہیں یا غیر الہامی چنانچہ اس سلسلہ میں علماء ہنود کے یہاں مختلف آراء ملتی ہیں۔ ذیل میں ان آراء کو پیش کیا جارہا ہے۔ چنانچہ شیخ محمد یوسف (سابق ایڈیٹر اخبار نور) نے اپنی کتاب آریہ مذہب کی حقیقت میں ویدوں کے متعلق درج ذیل باتیں تحریر کی ہیں:

گوسائیں تلسی جی مہاراج مصنف رامائن۔ رامائن بال کانڈ میں فرماتے ہیں:

چرت سندھ گرجا رمن وید نہ پاویں بار
برنوں تلسی داس کم ات مت مند گوار

گوسائیں تلسی داس جو ہندو مذہب کے ایک بڑے عالم گذرے ہیں۔ جن کی کتاب رامائن کی ہندو مندروں میں صبح شام کتھا ہوا کرتی ہے ایسا زبردست عالم اور صوفی ویدوں کے متعلق کہتا ہے کہ اور تو اور شوجی اور پاربتی تک کی تعریف تو وید کر نہیں سکتے۔ الہامی کہنا تو الگ رہا اب وہ کتاب جو کسی مہاپرش کی تعریف نہیں کر سکتی اس کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے۔[۵۷]

اس مصنف نے آگے لکھا ہے:

ڈاکٹر گوکل چند صاحب نورنگ ایم۔اے ایک راسخ الاعتقاد آریہ ہیں۔ انہوں نے نومبر ۱۹۱۴ء کے لائل گزٹ میں شری گرونانک دیو جی مہاراج کے متعلق ایک مضمون لکھا تھا جس میں وہ کہتے ہیں کہ شنکراچاریہ کے بعد جس قدر ہادیان مذہب اس ملک میں گزرے ہیں ان میں سب سے بلند پایہ گرونانک صاحب ہیں۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسقدر بلند پایہ بزرگ کی گواہی ویدوں کے متعلق کیا ہے۔ سو اس کے لیے شری گرونانک دیو جی مہاراج فرماتے ہیں:

پڑھ پڑھ پنڈت منی تھکے ویدوں کا ابھیاس
ہر ناچیت نہ آوے نہ نج گھر ہوئے واس

یعنی بڑے بڑے رشی اور منی بھی ویدوں کو پڑھ پڑھ کر تھک گئے یا ہار کر رہ گئے نہ تو انہیں ویدوں کے مطالعہ سے معرفت حاصل ہوئی اور نہ موکش یعنی مکتی۔ اب اس سے بڑھ کر اور کون سی بڑی شہادت ہو سکتی ہے؟ اور ان شہادتوں کے سامنے چون و چرا کی گنجائش ہی کیا رہ جاتی ہے۔[۵۸]

ان کے علاوہ بعض ہندو مفکرین ویدوں کو الہامی مانتے ہیں۔اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہندو مت کے مشہور مفکر و عالم سوامی دیانند سرسوتی کی رائے ان کی کتاب ستیارتھ پرکاش کے حوالہ سے ذیل میں پیش ہے:

''جس طرح ایشور پاک، تمام علوم کا جاننے والا ہے، بے لوث صفات، فعل اور فطرت رکھنے والا، عادل رحیم وغیرہ صفات سے موصوف ہے، اسی طرح جس کتاب میں ایشور کی صفات، فعل اور فطرت کے مطابق بیان ہو وہ ایشور کی بتائی ہوئی ہے کسی اور کی نہیں۔نیز جس میں سلسلۂ کائنات، 'پرمیکش' وغیرہ تہذیب صالح اور پاکیزہ منش لوگوں کے چال چلن کے خلاف بیان نہ ہوں وہ ایشور کا کلام ہے۔جس طرح ایشور کا علم منزہ من الخطاء ہے اسی طرح جس کتاب میں غلطی سے مبرا علم کا بیان ہو وہ ایشور کا کلام ہے۔''[۵۹]

اس کے علاوہ بھی ویدوں کے متعلق نظریات پائے جاتے ہیں جو اس بات پر شاہد عدل ہیں کہ ویدوں کے الہامی ہونے کو تحقیق سے نہیں کہا جا سکتا ہے۔ابوریحان البیرونی اپنی کتاب **تحقیق ما للھند** میں تحریر کرتے ہیں کہ ویدوں کے پڑھنے کا طریقہ نہایت پیچیدہ اور مشکل تھا، اور ان کا پڑھنا پڑھانا ایک مخصوص طبقے کے لیے تھا، اس لیے ایک خیال یہ بھی ہے کہ زمانۂ قدیم میں تمام دینی اور دنیاوی رسومات کے مٹ جانے کے ساتھ وید بھی مٹ گئے۔[۶۰]

چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو ویدوں کے متعلق گویا ہیں: اس پر یہ انسانی کاوش کا نتیجہ ہیں اور مختلف خاندانوں کے شاعر پنڈتوں نے انہیں تصنیف کیا ہے۔ وہ ان کو ایشور کے الہامی کلام کے بجائے انسانی فکر اور طرزِ زندگی کے ماخذ کی حیثیت سے اہمیت دیتے ہیں۔ بناء بریں پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب Discovery of India میں تحریر کرتے ہیں:

''بہت سے ہندو ویدوں کو آسمانی صحیفہ تسلیم کرتے ہیں، میرے نزدیک یہ بڑی بدنصیبی ہے، اس لیے کہ انہیں آسمانی صحیفہ سمجھ لینے کے بعد ہمارے لیے ان کی حقیقی اہمیت اس حقیقت سے ختم ہو جاتی ہے کہ وہ انسانی ذہن اور اس کی فکر کے ابتدائی نقوش ہیں۔حقیقت میں وہ ذہن اور وہ فکر کتنی عجیب

وغریب تھی،اس میں مختلف طرح کی چیزیں جمع ہیں، گیت، دعائیں،قربانی کے رسوم،سحر وافسوں اور حسین فطری شاعری،ان میں نہ عبادت اور نہ پرستش ہے اور نہ دیوی دیوتاؤں کے مندر ہیں۔ان صحیفوں میں زندگی کا جوش اور ولولہ ابل رہا ہے۔ویدک آرین لوگوں میں یہ جوش حیات اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ روحانی مسائل کو ذرا بھی اہمیت نہیں دیتے تھے۔وہ صرف ایک مبہم تصور رکھتے تھے کہ موت کے بعد ایک قسم کی زندگی ہے اور بس۔''[۶۰]

آگے گویا ہیں کہ، پہلا ویدرگ وید غالباً ان کتابوں میں جو نوع انسانی کے پاس موجود ہیں ،سب سے پہلا اظہار خیال نظر آتا ہے،اس میں شاعری کا گیت اور مسرت کا جوش جو حسن قدرت اور اسرار فطرت کو دیکھ کر پیدا ہوتا موجود ہے ڈاکٹر میکن کول نے کہا ہے:

''انسانی الوالعزمی کی ابتدائی کہانی ہے۔اس سفر کی کہانی جو انسان نے اپنی دنیا کی حقیقت اور انسانی زندگی کے بھیدوں کے انکشاف سے شروع کیا تھا۔''[۶۲]

ویدوں کی موضوعاتی تقسیم

ہندو اسکالر نے تمام ویدوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔یہ تقسیم زمانۂ تصنیف اور ان کے موضوع کی بنیاد پر ہے۔چاروں ویدوں کا پہلا حصہ سمہتا کہلاتا ہے جو دراصل ویدوں کے اصل اشعار اور اس کا سب سے قدیم حصہ ہے۔اس حصہ میں زیادہ تر مظاہر فطرت کی حمد وثنا اور قربانی میں پڑھے جانے والے منتر ہیں۔اس کے علاوہ دیوی اور دیوتاؤں کا ذکر ملتا ہے۔

دوسرا حصہ برہمن کہلاتا ہے جو برہمنی عہد میں تصنیف ہوا۔اس حصہ میں یگیہ، ہون اور مذہبی رسوم کے قاعدوں کی تفصیل ملتی ہے۔تیسرا حصہ آرنیکا کہلاتا ہے اور یہ حصہ ان بوڑھوں کے لیے ہے جو غیر شادی شدہ ہیں اور اسی طرح وہ لوگ جو جنگلوں، بیابانوں میں غور وفکر کی زندگی گزارتے تھے اور مکمل رسوم وقربانی کے عمل کو ادا کرنے سے معذور تھے۔اور چوتھا حصہ اپنشد کہلاتا ہے۔[۶۳]

ویدوں کی تفصیل

رگ وید

رگ وید سب سے قدیم ہے اور مستند بھی ہے، البتہ تینوں وید اسی سے ماخوذ ہیں۔ یہ دس منڈلوں (کتابوں) ایک ہزار سترہ شلوکوں (نظموں) اور دس ہزار منتروں (اشعاروں) پر مشتمل ہے، اس میں گیارہ نظموں کا بعد میں اضافہ کیا گیا ہے جنہیں ''دال کھلبیہ'' کہتے ہیں۔[۶۴] ریڈ گوزن ریڈی اپنی کتاب 'ویدک ھند'، مترجم مولوی احمد انصاری' نے لکھا ہے کہ رگ وید کے شلوک یا نظمیں مختلف زبانوں کی تصنیف ہیں۔[۶۵]

یہ شلوک مختلف زبانوں کی نمائندگی بھی کرتی ہیں، ان کا ادبی معیار بھی مختلف ہے اور ایسی وزن پر ہے جس کو ''رگ'' کہا جاتا ہے۔ اس کے پڑھنے کے تین طریقے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ سادہ طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہر لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جاتا ہے۔ تیسرا طریقہ افضل مانا جاتا ہے، اور جس میں زیادہ ثواب ہے وہ یہ کہ پہلے اس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا پڑھا جائے اس طرح کہ ہر لفظ صحیح طرح سے ادا ہو پھر اس جملہ کو اس طرح دہرایا جائے کہ اسکے ساتھ آگے کا بغیر پڑھا ہوا جملہ بھی ملایا جائے۔ اس کے بعد ملائے گئے جملہ کو تنہا پڑھا جائے اور پھر اس جملہ کو دہرایا جائے اور آگے کا ایک جملہ اس میں شامل کیا جائے۔ اس طرح خاتمہ تک پڑھا جائے تا کہ ختم ہونے تک دو مرتبہ ہو جائے۔ نیز اس کے اندر حمد وثنا کا علم پایا جاتا ہے۔ اس کے اندر اگنی، وشنو، برہاسپتی، پرتھوی، ویاس، سوریہ، اساس، واتو وغیرہ دیوتاؤں کی تعریف بیان کی گئی ہے۔

مذکورہ ہندو دھرم کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رگوید، ویدک دور یعنی ۱۷۰۰ سے ۱۱۰۰ قبل مسیح تک کے دور میں تصنیف کیا گیا ہے، لیکن اس کے بعد بھی بہت سے مصنفین نے اس میں بہت سی سطروں کا اضافہ کر ڈالا ہے۔ حافظ محمد شارق نے اپنی کتاب 'ھندو دھرم اور اسلام کا تقابلی مطالعه' میں مسٹر گووند داس کی کتاب ہندوازم کے حوالہ سے تحریر کیا ہے:

''رگ وید کے منتر نہ تو کسی ایک شخص کی تصنیف ہیں نہ کسی ایک زمانہ کی۔ یہ

منتر غالباً مختلف زمانوں میں مختلف مصنفین نے تصنیف کئے اور یہ بعید از
قیاس نہیں کہ ان میں سے بعض منتر آریوں نے ہندوستان میں آنے سے
قبل تصنیف کئے ہوں۔ یہ تمام منتر سینہ بسینہ چلے آئے تھے،اور ہر زمانہ
کے شعراء اس میں رفتہ رفتہ اضافہ کرتے رہتے تھے۔غالباً جب یہ مجموعہ
بہت ضخیم ہوگیا تو اسے موجودہ شکل میں مدون کردیا گیا۔''[۶۶]

آگے تحریر کرتے ہیں کہ آج رگوید کے بہت سے منتر ہندو علماء کے نزدیک مشتبہ ہیں جبکہ رگوید کے منتروں کی ابتدائی تعداد ۱۰۰۰۰ تھی لیکن اب رگوید کے منتروں کی تعداد میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔

پنڈت دیانند کے مطابق ۱۰۵۸۹/ ہے۔
انوواک النوکرمنی کے مطابق ۱۰۵۸۰/ ہے۔
سائن اچاریہ کے مطابق ۱۰۰۰۰/ ہے۔
پنڈت شیوشنکر آریہ کے مطابق ۱۰۴۰۲۔
پنڈت جگن ناتھ کے مطابق ۱۰۴۵۲۔
ستیہ ورت شاستری کے مطابق ۱۰۴۴۲۔[۶۷]

اتھروید

اس میں کل چھے ہزار منتر ہیں، جو بیس ادھیائے میں تقسیم کئے گئے ہیں۔تقریباً ایک سو دو منتر رگوید سے ماخوذ ہیں۔اس کا زیادہ تر حصہ سحر و فسوں اور جادو کے متعلق ہے۔نظم کے لحاظ سے بھی یہ پہلے ویدوں سے مختلف ہے اور اس قسم کی نظم کو ''بھار'' کہتے ہیں۔یہ ناک سے آواز نکالنے کے انداز میں پڑھی جاتی ہے۔آگ کی قربانیوں کے علاوہ اس میں میت کے لیے مختلف احکام بتائے گئے ہیں۔بعض علماء کے نزدیک اتھروید کی موجودہ صورت بعد کی مرتب کردہ ہے اور نہ یہ کہ صرف رگوید سے مختلف ہے بلکہ فکر کی بے حد ابتدائی حالت کو پیش کرتا ہے۔رگ وید کا تعلق تمام تر اعلیٰ دیوتاؤں سے ہے جن کے بارے میں خیال یہ ہے کہ وہ اعلیٰ شائستہ و مقدس جماعت ہے۔اس کے برعکس اتھروید میں شیطانی عالم سے فریاد

کی جاتی ہے اور عام لوگوں میں رائج جادو کے تصورات سے معمور ہے۔ اس لیے ان علماء کے نزدیک وید بہت قدیم ہے۔ دونوں یعنی رگوید اور اتھر وید مل کر اپنے مشمولات میں ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔ [۶۸]

اس کے بارے میں سوامی دیانند لکھتے ہیں:

''اتھر وید کا پہلا منتر 'اوم وشنو دیوی' ہے۔ لیکھرام کلیات آریا مسافر اور مہا بھاشیہ کی مصنف کے مطابق بھی پہلا منتر اوم وشنو دیوی ہے۔ لیکن موجودہ وید پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منتر چھبیسواں ہے یعنی پہلے پچیس منتر بعد میں ملائے گئے ہیں۔'' [۶۹]

سام وید

تیسرا وید سام وید ہے۔ لفظ سام سنسکرت کے لفظ Saman سے مشتق بتایا گیا ہے۔ جس کے معنی موسیقی کے ہیں، اگرچہ سام وید بھی رگوید کی طرح قدیم مانا جاتا ہے لیکن اس کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔ اس میں محض گیت اور بھجن ہیں۔ ۷۵ منتروں کے علاوہ تمام منتر معمولی فرق کے ساتھ رگوید سے ہی ماخوذ ہیں۔ اگر ہم سام وید میں تحریف کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ آریوں کا شائع کردہ نسخہ سب نسخوں سے مختلف ہے۔ ان کے مطبوعہ سام وید میں مہانامنی سوکت کے ۱۰؍منتر اور آرنیک ادھیائے کے ۵۵؍منتر علماء سلف کے نزدیک وید کا جزء نہیں، اسے وید میں بعد میں ملایا گیا ہے۔ اس طرح ہر مطبوعہ سام وید کے منتروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

آریوں کے شائع کردہ سام وید میں منتروں کی تعداد ۱۸۳۴ ہے۔ جیوانند ودیا کے مطبوعہ سام وید میں منتروں کی تعداد ۱۸۰۸؍ ہے۔

'پنڈت سات ولیکر' کے نزدیک منتروں کی تعداد ۷۰؍ ہے۔ سوامی ہر پرشاد کے شائع کردہ سام وید میں ۶۵ منتر ہیں۔ [۷۰]

اس میں قربانیوں کے علاوہ اوامر ونواہی کا بھی تذکرہ ملتا ہے، اس کو گانے یا بھجنوں کے انداز میں پڑھا جاتا ہے۔ زیادہ تر اس کو سوم یگیہ کے موقع پر گایا جاتا ہے۔

یجروید

یجروید کے متعلق علماء ہنود کا نظریہ ہے کہ یہ تمام رگوید سے ہی ماخوذ ہے۔اس وید کا درجہ بقیہ تینوں ویدوں سے کم مانا جاتا ہے،اور اسکو مخصوص مذہبی رسومات کے مواقع پر پڑھا جاتا ہے،اس کا زمانہ تصنیف ۱۰۰۰ر سے ۱۴۰۰ر قبل مسیح کے درمیان بتایا جاتا ہے،اس وید کے دو حصے ہیں سمھتا اور تتیر یاسنگھتا۔ یہ وید ان منتروں پر مشتمل ہے جو خاص قربانی کے موقع پر گائے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ یجروید میں بہت سے غیر معروف دیوتاؤں کا ذکر بھی ملتا ہے اور جنگی جائے رہائش ،کنواں، آگ، پہاڑ،ندی ،ہوا، اور نالہ بھی مذکور ہے۔اسی طرح قربانی میں مستعمل ہونے والی مختلف اشیاء مثلاً دودھ ،گھی ،اناج ،لکڑی وغیرہ کو بھی مخاطب کیا گیا ہے۔لیکن دیگر ویدوں کی طرح یجروید بھی تحریف سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ہندوستان میں اس کے مختلف نسخے پائے جاتے ہیں جن میں کثرت سے اختلاف پایا جاتا ہے۔

ممبئ والے یجروید میں ۱۲۵ر ادھیائے کے ۴۷منتر ہیں ،لیکن سوامی دیانند نے جو یجروید شائع کرایا ہے اس میں ایک منتر کا اضافہ ہے یعنی ۴۸ منتر ہیں،ایک منتر وید میں ملایا گیا ہے۔

یجروید بھاشیہ، بھاشیہ دیانند ادھیائے ۹منتر ۲۰ر میں لفظ ''گمیات'' ملایا گیا ہے۔

یجروید بھاشیہ بھاشیہ دیانند ادھیائے ۲۶رمنتر ۲۱ر میں لفظ 'اگناوہ' کو 'گراوا' بنادیا گیا ہے۔

یجروید بھاشیہ دیانند ادھیائے ۱۶ر منتر ۳۸ر میں لفظ ''میدھیا '' کو ناموزوں سمجھ کر 'میگھیانا' بنادیا گیا ہے۔

یجروید بھاشیہ، بھاشیہ دیانند ادھیائے ۳۸رمنتر ۱۴ر میں لفظ 'گھرم' کو 'دھرم' کردیا گیا ہے اور 'سگھرم' کو 'سدھرم' کیا گیا ہے۔یجروید بھاشیہ، بھاشیہ دیانندادھیائے ۲۶ر میں لفظ 'ایوتے' کو 'اپوتے' کردیا گیا ہے۔

یجروید ادھیائے ۲۵رمنتر ۴۸ر اور ادھیائے ۱۳ر کے منتر ۵۸ر کا ایک کثیر حصہ ''لوکا نتا اندرم لوکم'' آریوں کے مطبوعہ یجروید میں نہیں ملتا ہے۔

یجروید ادھیائے ۱۴رمنتر ۳۱ کا آخری حصہ آریوں کے شائع کردہ نسخہ کے علاوہ کسی میں نہیں ملتا ہے۔اس کے علاوہ یجروید میں منتروں کی تعداد میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے ،سوامی دیانند کے

نزدیک یجروید کے کل منتر کی تعداد ۱۹۷۵ر ہے۔شیوشنکر کے نزدیک ۹۸۷ر ہے۔سوامی پرشاد کے نزدیک کل منتر ۱۰۰۰ر ہیں۔[اے]

برہمن

حسین فاروق نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ''اسلامی اور ہندومعاشرہ:موازنہ اورتنقیدی جائزہ''میں ہسٹری آف انڈیا کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

''سم ہتا کے بعد ہندومت کے بنیادی ماخذ برہمن نامی کتب ہیں،جوادبی حیثیت سے ویدوں سے مختلف اورممیّز ہیں۔یہ نثر میں ہیں اورعام لوگوں کے لیے ان میں مختلف رسوم کی تشریح ہے۔جہاں ویدی ادب ہندوستان میں آریاؤں کی ابتدائی دورکا آئینہ دار ہے،جس میں آریائی پجاری فتوحات کی خوشی سے سرشار اپنے دیوتاؤں کی تعریف میں بھجن گاتے ہیں، وہاں برہمن اوراس کے بعد اپنشد ادب آریاؤں کے اس عہد کی یادگار ہے جب وہ ہند میں سکونت اختیار کرتے ہیں۔برہمن ادب میں اس ابتدائی دور کے نقوش پائے جاتے ہیں۔آریاؤں کی فطری دور سے عقلی دور میں داخل ہونے کا اظہار ہے۔پروفیسر میکڈونل کے مطابق برہمن ادب ایسے زمانے کی روح کا مظہر ہے جب ساری عقلی جدوجہد،قربانیوں،ان کے رسوم،ان کی قدر وقیمت اوران کے ماخذ پر مرکوز تھی''۔[۲ے]

آرنیک

آرنیک کے متعلق یہی مقالہ نگار تحریر کرتا ہے کہ

''برہمن کی مزید ترقی آرنیک یابن باسی تصانیف ہیں،یہ ان بوڑھوں کے لیے لکھی گئیں تھیں جوجنگلوں میں غور وفکر کی زندگی گزارتے تھے اورمکمل رسوم اورقربانی کے عمل کوادا کرنے سے معذور تھے۔ان تصانیف میں ان

مراقبوں کا تذکرہ ہے جو قربانی کے قائم مقام تصور کئے جاتے تھے۔ اور یہ تصور عام تھا کہ سنیاسی زندگی کے ان علامات اور مراقبے کو دوسرے رسوم پر فوقیت ہے۔'' [۴۳]

اپنشد

اپنشد سنسکرت زبان کا لفظ ہے، 'اپ' بمعنی قریب اور 'شد' بمعنی بیٹھنا سے ماخوذ ہے، پورے معنی ہوئے قریب بیٹھنا۔ یہ مذہبی لٹریچر نویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں تصنیف ہوا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اپنشدان کتابوں کو کہتے ہیں جنہیں مختلف رشیوں، سنتوں اور جوگیوں نے مرتب کیا ہے۔
اس کے بعد ایک روحانی زندگی کا آغاز ہوا اور یہ زندگی اپنشد کی تعلیمات کی روشنی میں شروع ہوئی، ان کا زیادہ تر حصہ مکالمہ کی صورت میں ہے، نیز یہ فلسفیانہ فکر و تصور پر مبنی ہیں۔ ان کے مطابق عام رائے یہ ہے کہ یہ آرنیک کے ضمیمے ہیں اور آرنیک برہمنوں سے متعلق ہیں۔ اس سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اپنشد کو اس زمانہ کی تصنیف و تالیف کہا گیا ہے جب آریہ قوم ہندوستان میں پوری طرح سکونت پذیر ہوگئی اور یہاں ایک مستحکم تہذیب کی بنیاد پڑ چکی۔ [۴۴]
پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں ان کے زمانہ تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

> The Upanishads dating from about 800 B.C. take us a step further in the development of an Aryan thought. It is a big step. [۴۵]

البتہ رادھا کرشنن اپنشد کے زمانہ تصنیف کے متعلق کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

> We get to the third stage of Indian civilization in the order or ancient Upanishads Wich are pre-Buddhistic (900 to 600 BC) [۴۶]

اپنشد کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کہتے ہیں کہ تحقیق کے یہ جذبے ذہنی تگ و دو اور حقیقت

اشیاء کے ولولے سے معمور ہیں۔ [۷۷]

داس گپتا اپنی کتاب ہسٹری آف انڈیا میں رقم طراز ہیں کہ:

''اپنشدوں کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے اور ان کے ناموں کی فہرست بھی دی گئی ہے جبکہ چارلس اے مور اپنی کتاب Indian Philosophy میں اپنشدوں کی تعداد دو سو بتاتے ہیں''۔ [۷۸]

اگر روایتاً ان کی تعداد ایک سو اٹھائیس ہے تو ان میں درج ذیل دس اپنشد اصولی اور بنیادی ہیں:

(۱) ایساء (۲) کنیا (۳) کٹھہ (۴) پرشن (۵) منڈک (۶) مانڈوکیہ (۷) تیتریئہ (۸) ایتریئہ (۹) چھاندوگیہ (۱۰) بر ہدآرن یک [۷۹]

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اپنشدوں کی تالیف و ترتیب میں مردوں کے علاوہ خواتین کا بھی حصہ ہے۔ ان مصنفین مردوں میں ''یجنوالکیا'' اور خواتین میں ''گارگی'' معروف ہیں۔ گارگی کے متعلق مؤرخین نے لکھا ہے کہ اس خاندان کو تاریخ عالم کی پہلی فلسفی خاتون ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ [۸۰]

ہندو محققین نے لکھا ہے کہ صداقت و حقائق کی تلاش و جستجو اپنشدی تعلیمات کا مرکزی موضوع ہے لیکن اسلامی اور ہندو معاشرہ، موازنہ اور تنقیدی جائزہ کا مصنف حسین فاروق، امولیہ رنجن مہاپتر کی کتاب فلسفۂ مذاہب کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ

''اپنشدوں سے مراد ایسا علم ہے جو غلطیوں کو تباہ کر دے اور انسان کو صداقت تک رسائی حاصل کرنے کے قابل بنادے۔'' [۸۱]

ہندو مصادر کا دوسرا حصہ سمرتی پر مبنی ہے، البیرونی نے اپنی کتاب تحقیق ماللھند میں لکھا ہے کہ اس ادب کو برہما کے درج ذیل دس بیٹوں سے منسوب کیا جاتا ہے:

(۱) سمب (۲) ساتاتپ (۳) پراشر (۴) سم ورت (۵) دکش (۶۔ وشھ) (۷) انگی رس (۸۔ یم (۹) وشنو (۱۰) منو (۱۱) یجناوالکیہ (۱۲) اتری (۱۳) ہارت (۱۴) لکھتیا (۱۵) ساگھ (۱۶) گوتم (۱۷) ورہسپتی (۱۸) کاتیاین (۱۹) ویاس (۲۰) اسانس۔ [۸۲]

سمرتی کے اندر جو ادب شامل ہے اس میں ایک حصہ اتہاس یعنی تاریخ پر بھی مبنی ہے۔

رامائن

رامائن رام کی مہمات کو رامائن کہا جاتا ہے۔رامائن سنسکرت رزمیہ داستانوں میں سے پرانی ہے۔اس کی تصنیف کے بارے میں لوگوں کے متعدد نظریات وخیالات پائے جاتے ہیں۔ان میں سے ایک رائے یہ ہے کہ یہ پانچ سو برس قبل مسیح میں مرتب ہوئی۔حسین فاروق اپنے مقالہ میں لکھتا ہے۔اس کو ہندو سادھو''والمیکی'' سے منسوب کیا جاتا ہے۔والمیکی نے اس کو اس وقت مرتب کیا تھا جب رام کی بیوی سیتا جنگل میں اس کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی، رامائن کو موجودہ شکل ایک یا دو برس بعد میں ملی۔قدیم رامائن کے علاوہ ایک اور کتاب جو نسبتاً جدید دور کی ہے ادھیاتم رامائن کہلاتی ہے۔اس کا مصنف ویاس کو قرار دیا جاتا ہے۔مگر وہ برہمانڈ پران کا ایک حصہ ہے، اس میں رام کو انسان کے بجائے ایک دیوتا بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ جو انسانیت کو دکھوں سے نجات دلاتا ہے، رامائن میں رام چندر کی زندگی اور کارنامے ،رام اور سیتا کی محبت، راون کی سیتا کے ساتھ زیادتی، رام اور راون کی جنگ بیان کی گئی ہے۔یہ سات کانڈوں یا حصوں میں منقسم ہے۔پوری نظم ۲۴ رہزار اشعار پر مشتمل ہے۔رامائن کے سات حصے درج ذیل ہیں:

۱۔بال کانڈ: جس میں رام کی پیدائش بچپن، رشی وشوامتر کی درخواست پر راکھششوں کا خاتمہ، سیتا سے اس کی شادی کے واقعات شامل ہیں۔

۲۔ایودھیا کانڈ: اس میں ایودھیا کے وہ واقعات شامل ہیں جو رام کی ولی عہدی، رسم تاجپوشی کے انتظامات اور وعدے کے مطابق جلاوطنی سے متعلق ہیں۔

۳۔آرنیہ کانڈ: رامائن کا یہ حصہ رام کے بن باس کی زندگی، سیتا کی ہمراہی اور سیتا کے ساتھ راون کی زیادتی جیسے واقعات پر مشتمل ہے۔

۴۔کش کندھیہ کانڈ: یعنی کش کندھیہ (میسور) میں قیام، وانروں کے بادشاہ بالی کا قتل، ہنومان کا سیتا کی تلاش میں لنکا پہنچ کر وہاں دہشت پھیلانا جیسے واقعات شامل ہیں۔

۵۔سندر کانڈ: اس میں رام اور وانروں کے بادشاہ سوگریو کی فوج راکھششوں کے بادشاہ راون کے خلاف جنگ کے لیے روانہ ہونے کی منظر کشی کی گئی ہے۔

۶۔ یدھ کانڈ: راون اور رام کی جنگ اور راون کی شکست وغیرہ کا ذکر ہے۔

۷۔ اتر کانڈ: یہ رامائن کا آخری حصہ ہے جو کہ ایودھیا میں رام کی زندگی، سیتا کی جلاوطنی، اس کے دو بیٹوں کی پیدائش، رام اور سیتا کا دوبارہ ملاپ، سیتا کی موت اور رام کا آسمان پر چلے جانا جیسے واقعات شامل ہیں۔ البتہ اس کو آخری حصہ کے بارے میں خیال یہ ہے کہ یہ بعد کا اضافہ ہے۔[۸۳]

مہابھارت

رزمیہ نظمیں رامائن اور مہابھارت دونوں ہندوؤں کے لیے اہم تصور کی جاتی ہیں، البتہ مہابھارت کا اثر سماجی زندگی پر بہت زیادہ ہے، نیز اس کا شمار دنیا کی بڑی داستانوں میں ہوتا ہے، اس میں ایک لاکھ بند ہیں جو بتیس ارکان پر مشتمل ہیں۔ اس لیے یہ دنیا کے ادب میں واحد طویل ترین نظم ہے۔ روایت کے مطابق اس نظم کا مصنف 'ویاس' نامی ایک شخص تھا جس نے اپنے شاگرد 'ویشم' کو اس کی تعلیم دی تھی۔ ویشم نے اس نظم کو عوام کے سامنے سب سے پہلے اس عظیم یگیہ کے موقع پر پیش کیا جس کا انتظام راجہ 'جنم جے' کی طرف سے ہوا تھا۔ راجہ 'جنم جے' اس داستان کے مرد شجاع ارجن کا پوتا تھا۔

اس نظم کا مرکزی موضوع اس عظیم جنگ کا واقعہ ہے جو کوروؤں اور پانڈوں میں ہوئی تھی۔ جنگی واقعات کے ساتھ ساتھ اس میں دینی، اخلاقی اور سیاسی تعلیم کا بھی سامان موجود ہے۔ راہ عمل اور راہ علم کا امتزاج بھگوت گیتا کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ''شانتی پرون'' مہابھارت میں شامل ہے یہ ایک طویل ترین مقالہ ہے جس میں آئین حکمران اور اخلاقیات کے بارے میں بتایا گیا ہے۔[۸۴]

بھگوت گیتا

بھگویت گیتا مہابھارت کا وہ حصہ ہے جس میں شری کرشن نے ارجن کو دینیات، اخلاقیات اور سماجی زندگی کا وہ درس دیا ہے جو ہندو معاشرہ کے ہر فرد کیلیے قابل تقلید نمونہ ہے۔ ہندوؤں کے یہاں گیتا کو وہ تقدس حاصل ہے کہ مندروں میں اس کی قسم کھائی جاتی ہے اور عملی زندگی میں گیتا کو ویدوں سے

بھی برتر خیال کیا جاتا ہے۔ ہندو عالم ’کرپا مورتی‘ کے مطابق ’گیتا سورج دیوتا‘ ’دوسوان‘ کو سنائی گئی۔ بھگوان کرشن نے دوبارہ پانچ ہزار سال پہلے اسے ارجن کو سنایا۔[۸۵]

جبکہ مغربی مفکر ’کولوفون‘ گیتا کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ مابعد الطبعیات اور اخلاقیات اور یوگ شاستروں سے مزین ہے، اور یہ حقیقت مطلقہ کی سائنس اور حقیقت کے ملاپ اور اتصال کا فن ہے۔[۸۶]

پران

پران کو بھی ہندومت کے کتب مصادر کا اہم جز سمجھا جاتا ہے۔ پران کے معنی قدیم یا ابدی ہیں، پران ہندی ادب اور وہ مذہبی کتابیں ہیں جو کہ رزمیہ نظموں کے بعد لکھیں گئیں ہیں۔ پران میں کائنات، اس کی ابتداء اور اس کی تاریخ کے بارے میں معلومات پر مبنی ہیں۔ اس کے علاوہ پرانوں میں بادشاہوں اور ہندوؤں کے نامور سپوتوں کے کارنامے اور شجرۂ نسب وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ پرانوں کی کل تعداد اٹھارہ بتائی جاتی ہے اور ان کو مہاپران بھی کہا جاتا ہے۔ پرانوں کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ مہا پران (یعنی بڑے اور بنیادی پران)

۲۔ اپا پران (تحتی، ضمنی یا مددگار پران)

حافظ زاہد لطیف اور محمد عبداللہ اپنے ایک تحقیقی مقالہ ہندومت میں پران، تعارف و تجزیہ میں رقم طراز ہیں:

> ’’مہابھارت کا راوی ویاس کے بارے میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ پرانوں کی تدوین کرنے والا ہے تاہم اولین مکتوب ورزن گیتا امپائنز یعنی تیسری سے چوتھی صدی قبل مسیح میں لکھا گیا خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے عنوان غالباً تمام انڈیا میں مرتب ہوئے، اسی طرح پرانوں کے مکتوب صورت کی حقیقی تاریخ قطعی طور پر حتمی نہیں ہے اس لیے کہ ایک طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ لکھے جانے سے قبل زبانی روایت کئے جاتے رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ سولہویں عیسوی تک ان کی تدوین

ہوتی رہی ہے۔‘‘[۸۷]

مذکورہ حضرات نے آگے لکھا ہے کہ پرانوں کی تاریخ وتدوین مختلف اور درج ذیل ہے:

- مرکرندیا پران ۲۵۰ قبل مسیح کا ہے۔
- تلسیہ پران ۵۰۰-۲۵۰ قبل مسیح کا ہے۔
- وایو پران ۳۵۰ قبل مسیح کا ہے۔
- ہری ومسہ پران ۹۰۰-۴۵۰ قبل مسیح کا ہے۔
- کرما پران ۸۵۰-۴۵۰ قبل مسیح کا ہے۔
- واما نا پران ۹۰۰-۴۵۰ قبل مسیح کا ہے۔
- وشنو پران ۴۵۰ قبل مسیح کا ہے۔
- براہمند اپران ۹۵۰-۳۵۰ قبل مسیح کا ہے۔
- لنگا پران ۱۰۰۰-۶۰۰ قبل مسیح۔

اس کے ساتھ آگے یہ بھی لکھا ہے کہ آل انڈیا کاشی راج ٹرسٹ کا بانی نارائن سنگھ مہا پرانوں کی طباعت کا سہرا اپنے سر باندھتا ہے۔[۸۸]

پرانوں کے موضوعات کے متعلق مقالہ نگار لکھتا ہے کہ ان کے پانچ بنیادی موضوعات ہیں جن سے وہ بحث کرتے ہیں اور انہیں Puneh Lakshan یعنی (پانچ امتیازی نشانات) کہا جاتا ہے:

۱۔ سارگا (Sarga) اس میں تخلیق کائنات سے بحث کی جاتی ہے۔

۲۔ پرتی سارگا (Prati Sarga) اس میں تخلیق ثانی پر بحث ہوتی ہے یعنی جو تحلیل کے بعد دوبارہ تخلیق ہوئیں۔

۳۔ ومسہ (Vamsa) میں خداؤں اور مذہبی پیشواؤں کے انساب سے بحث ہوتی ہے۔

۴۔ مان ونترا (Manvantra) اس کے اندر تخلیق انسانی اور پہلے انسان کی کہانی، منو کے قانون کے ادوار ۸۱/ سماوی وفلکی یوگا۔ ۳۰/کروڑ ۸۶/لاکھ، پرمحیط دورانیہ تھا۔ پران علم الانساب اور اس کی حفاظت پر بہت زور دیتے ہیں جیسا کہ وایو پران میں مذکور ہے۔

۵۔ ومسانو کریتم (Vamsanu Caritam) سوریا (سورج) اور چاند دیوتاؤں کی حکومتوں

اور قصہ کہانیوں سے بحث ہوتی ہے۔[۸۹]

ہندوؤں کے مذہبی تہوار اور فرقے

حسین فاروق اپنے تحقیقی مقالہ 'مسلم اور ہندو معاشرہ: موازنہ اور تنقیدی جائزہ' میں لکھتے ہیں کہ ہندوؤں میں مذہبی فرقوں کو 'سمپر دائے' کا نام دیا جاتا ہے۔ ہر سمپر دائے میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک گرہست یعنی گھر بار رکھنے والے اور دوسرے بیراگی یعنی فقیر۔ ان دونوں میں گرہست طبقہ کی زیادہ عزت ہوتی ہے۔

ہندو قوم درج ذیل پانچ مذہبی فرقوں میں منقسم ہے:

۱۔ وشنو، اس فرقہ کا خاص دیوتا وشنو ہے۔

۲۔ شیو، اس فرقہ کے لوگ شیو دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔

۳۔ شاکت، اس فرقہ کا دیوتا شکتی ہے۔

۴۔ سورہ، یہ لوگ سورج کی پوجا پاٹ کرتے ہیں۔

۵۔ گانپتیا، یہ لوگ گنپتی یعنی گنیش کی پوجا کرتے ہیں۔

اس مقالہ کا محقق آگے لکھتا ہے کہ ہندوؤں میں مذہبی فرقوں کا ذکر سب سے پہلے سوامی شنکراچاریہ کے ایک چیلے آنندگری کی کتاب ''شنکروگ بجئے'' میں کیا گیا ہے۔ اس کے مدھواچارج نے سرب ''درشن سنگرہ'' نامی کتاب میں چند سمپر دایوں اور ان کی تعلیمات کا ذکر کیا ہے، ان دونوں کتابوں سے پروفیسر ایچ۔ ایچ۔ ولسن نے قدیم زمانے کے سمپر دایوں کا حال کسی قدر دریافت کیا ہے۔ پروفیسر ولسن کے مطابق اس وقت وشنو فرقے کی چھ اقسام پائی جاتی ہیں۔

۱۔ **بھاکت:** یہ لوگ وشنو کو باسو دیو کی صورت میں پوجتے تھے اور بدن پر کوئی نشان نہیں لگاتے تھے۔

۲۔ **بھاگوت:** یہ لوگ وشنو کو بھگوان کی صورت میں پوجتے تھے، اور اپنے بدن پر وشنوؤں کی صورت میں عام نشانیاں یعنی سنکھ، چکر، گد، پدم رکھتے تھے، اور سالگرام پتھر اور تلسی کے پودوں کو پوجتے تھے۔

۳۔ **وشنو:** یہ لوگ وشنو کو نارائن کر کے پوجتے تھے، اور بدن پر عام وشنوؤں کی عام نشانیاں رکھتے تھے۔

۴۔چکرین یا پنچ راترک: یہ فرقہ وشنو کی شکتی کو پوجتا تھا اور پنچ راترک کی رسومات ادا کرتے تھے۔

اس طرح کے لوگ اب بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں جو ایک نوعیت سے کرشن و رام کے اور دوسری نوعیت سے شکتی یا دیوی کے پرستاروں میں ملے ہوتے ہیں۔

۵۔بیکھانس: یہ لوگ بھی وشنو کو نارائن کر کے پوجتے تھے اور وشنوؤں کی نشانیاں بدن پر رکھتے تھے، اس فرقے میں اور دوسرے مذہبی فرقوں کی پرستش میں کوئی واضح فرق نہیں تھا۔

٦۔ کرم هین: کرم ہین کے معنی ماہرین بتاتے ہیں کہ جس کا کوئی کرم نہیں ہے، یہ لوگ کسی قسم کی عبادت یا رسومات کو نہیں مانتے تھے اس لیے کہ ان کے نزدیک ''سربم وشنوئم جگت''یعنی پوری کائنات وشنو ہی ہے۔

اس طرح شیو فرقے کی بھی چھ قسمیں ہیں:

۱۔ شیو لوگ اپنے بازوؤں پر شیولنگ کا چھاپہ لگاتے تھے۔

۲۔ رودروں کی پیشانی پر ایک ترشول کا نشان ہوتا تھا۔

۳۔ اوگر لوگ اپنے بازوؤں پر شیو جی کے ڈور کا نشان رکھتے تھے۔

۴۔ بھاگت لوگ اپنی پیشانی پر شیولنگ کا نشان لگاتے تھے۔

۵۔ جنگم سمپردائے کے سر پر شیولنگ کی ایک تصویر ہوتی تھی۔

٦۔ پاشوپت کے لوگ اپنی پیشانی، چھاتی، ناف اور بازوؤں پر شیولنگ کا چھاپہ لگاتے تھے۔

نیز اس کے علاوہ برہما، سورج، گنیش اور شکتی کے پرستار بھی الگ فرقوں کی صورت میں موجود تھے۔موجودہ دور میں ہندو مذہب دو بڑے فرقوں وشنو اور شیو میں منقسم ہیں جن کے بہت سارے ذیلی فرقے ہیں۔وشنو فرقے کی چار بڑی ذیلی شاخیں ہیں:

۱۔سری سمپر دائے

اس کا بانی رامانج اچارج ہے۔یہ رامانج سمپر دائے سے بھی معروف ہے،اس کا بانی شنکر رامانج ۱۰۱٦ء/صدی عیسوی میں مدراس کے ایک گاؤں پرمبر میں پیدا ہوا، والد کا نام کیشپ اور والدہ کا نام

دھرمی دیوی تھا،اس فرقہ کے یہاں نجات حاصل کرنے کے درج ذیل پانچ طریقے ہیں۔[۹۰]

۱۔ مندر میں جھاڑو دینا۔
۲۔ پرستش کے لیے پھول وغیرہ چن کرلے جانا۔
۳۔ خدا کی پرستش کرنا۔
۴۔ خدا کے ناموں کے گیت گانا اور شاشتروں کا مطالعہ کرنا۔
۵۔ مراقبہ اور زہد کے ذریعہ عشق الٰہی حاصل کرنا۔[۹۱]

۲-برہم سمپر دائے

اس فرقہ کا بانی مبانی مدھواچارج ۱۱۹۹ رصدی عیسوی کو دکن میں ایک برہمن کے گھر پیدا ہوا، جس کا نام ''مدھی جی بھٹ'' تھا جبکہ مدھواچار سمپر دائے کی کتابوں میں اس کو پون دیوتا کا اوتار قرار دیا گیا ہے، جس کے مطابق نارائن کے آدیش سے دھرم کو درست کرنے کے لیے پورن دیا تا اوتار لے کر مدھوا چارج کے نام سے ظاہر ہوا۔

حصول علم کے بعد مدھواچارج بیراگی بن گیا اور تھوڑے عرصے میں بھگوت گیتا کی فلسفیانہ تفسیر گیتا بھاشیہ لکھ کر معروف ہوگیا۔اس کتاب کے علاوہ مدھواچارج نے سوتر بھاشہ، رگ بھاشہ، وشوپ نشد بھاشہ، انو باکا نونے بیبر نہ، انو ویدانت، رس پرکرن، بھارت تاپتر یہ نرنے، بھاگوت تاتپتر یہ کرشنامرت ،مہارنوتنتر سارا اور سرب درشن سنگرہ جیسی کتابیں تصنیف کیں۔[۹۲]

۳۔رودر سمپر دائے

اس فرقہ کا دوسرا نام بلبھا چاری سمپر دائے بھی ملتا ہے جو اس فرقہ کا سرگرم رکن گزرا ہے البتہ اس فرقہ کا پہلا استاد وشنوسوامی تھا جس نے وید کا ایک بھاشیہ لکھا تھا، یہ فرقہ اپنے حلقے میں برہمنوں کے علاوہ کسی کو شامل نہیں کرتا:

''اس فرقے کے ہر چیلے کو بیراگی بننا ضروری ہوتا ہے......وشنوسوامی کی موت کے بعد اس کا چیلا ''گیان دیواس'' کا جانشین ہوگیا، دیو کے دو چیلے

کا نام دیواور ترلوچن تھے، اس کے بعد بلبھ سوامی اس فرقہ کا انچارج ہوا،
نیز اسی نے اس فرقہ کوشہرت بخشی۔'' [۹۳]

۴۔نمبادت یا سنکاری سمپر دائے

وشنو کے چوتھے بڑے فرقے کا نام نمبادت یا سنکاری سمپر دائے ہے۔نمبادت ایک بیراگی تھا جوفقیر بھاشکراچارج کے نام سے مشہور تھا، یہ سورج کا دیوتا تھا، برندابن کے قریب رہتے ہوئے اس نے ایک روز ایک فقیر کواس وقت بھوجن کی دعوت دی جب سورج غروب ہورہا تھا، چونکہ غروب آفتاب کے بعد بھوجن نہیں ہوسکتا تھا اس لیے اس نے سورج کوحکم دیا کہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جاتا کہ اس کا مہمان بھوجن کرسکے۔تب سورج اس کے حکم سے نیم کے درخت پر ٹھہر گیا۔چونکہ 'نمپ' نیم اور''ادت'' یا ارک سورج کو کہتے ہیں اس لیے اس کا نام نمبادت پڑ گیا،لہٰذا اس فرقہ کو بھی نمبادت کے نام سے شہرت ملی۔ [۹۴]

مذہبی تہوار

ہندوقوم میں تہوار کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ہر تہوار کے پس منظر میں کئی کہانیاں ہوتی ہیں ،اور ہر تہوار ہر علاقہ میں مختلف ومتنوع انداز سے منایا جاتا ہے،ذیل میں ہندوؤں کے چند قومی مذہبی تہوار کا تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

نوراتری اور دسہرہ

ستمبر اوراکتوبر کے مہینے میں منایا جانے والا یہ تہوار 'درگا دیوی' کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ [۹۵]
اس نوراتری کی تقریبات نو دن تک جاری رہتی ہیں۔دسویں کو ایک اور تقریب کا اضافہ کیا جاتا ہے جس کو دسہرہ کہا جاتا ہے۔اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ہندومتون مقدسہ میں درج ہے کہ اس دن رام نے درگا دیوی کی مدد سے راکھششوں کے بادشاہ راون کوشکست دی تھی۔اس دن راون کے مجسمے بنا کر جلائے جاتے ہیں اوران پر تیروں کی بوچھار کی جاتی ہے۔ [۹۶]

شوراتری

اس تہوار کو اس لیے منعقد کیا جاتا ہے کہ اس دن شیو دیوتا نے دنیا کو تباہی سے بچالیا تھا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ ''سمدرا منتھن'' ایک زہر کا برتن ہے، کسی طرح سمندر میں گر گیا، جس کی وجہ سے تمام دیوتا پریشان ہو گئے کہ اب ساری دنیا تباہ ہو جائیگی۔ چنانچہ سارے دیوتا گھبراتے ہوئے شیو کے پاس گئے تو شیو جی نے اس زہر قاتل کو پی لیا، تاہم یہ زہریلا پانی شیو کے گلے سے نیچے نہ اترا جس کی وجہ سے شیو کا گلا نیلا پڑ گیا۔ اس وجہ سے شیو جی کو نیلا کنتھا کہا جاتا ہے۔ [۹۷]

دیوالی

دیوالی کا لفظ 'دیپاوالی' سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں 'چراغ کی روشنی' اس کی کہانی ہندو معتقدین اس طرح بیان کرتے ہیں کہ 'حمنا' نامی بادشاہ کا ایک بیٹا تھا، جس کو سولہ سال کی عمر میں نجومیوں نے بتایا تھا کہ شادی کے چوتھے دن سانپ کاٹنے سے اس موت ہوگی۔ شادی کے بعد چوتھے دن اس کی دلہن نے سونے چاندی کے زیورات گھر کے دروازے پر رکھ کر ہر طرف دیئے جلا دیئے اور ساری رات لکشمی کے قصے بیان کرتی رہی، اور بھجن گاتی رہی۔ رات کو موت کا دیوتا 'یم' جب شہزادے کی جان لینے کے لیے آیا تو سونے چاندی اور چراغوں کی وجہ سے اس کی آنکھیں اندھی ہو گئیں اور ساری رات سونے چاندی کے ڈھیر پر بیٹھا رہا، صبح ہونے پر چپکے سے بھاگ گیا تب سے اسے ''یما دیپ دان'' کہا جاتا ہے۔ [۹۸]

ہولی

اس مذہبی تہوار کا پس منظر معتقدین ہنود یہ بیان کرتے ہیں کہ جنوں کے بادشاہ ''ہرانی کشیپ'' کی ایک چڑیل بہن تھی جس کا نام ''ہولیکا'' تھا۔ جنوں کے اس بادشاہ نے دیوتاؤں کو شکست سے دوچار کیا، اس کے بعد وہ اس قدر مغرور ہو گیا کہ اس نے تمام دنیا میں اپنی عظمت و اقتدار کا اعلان کیا۔ لیکن اس دوران اس کا بیٹا ''پراہلاد'' وشنو کا پیروکار بن گیا۔ بادشاہ نے اپنے بیٹے کو وشنو کی اتباع سے باز آنے کو کہا، لیکن بیٹے نے اپنے والد کی بات نہ مانی تو بادشاہ نے اس کو سزا دینے کا اعلان کیا۔ اس

کے لیے انھوں نے اپنی بہن ہولیکا سے مدد مانگی،اس لیے کہ ہولیکا آگ میں جلنے سے محفوظ ہے۔ چنانچہ ہولیکا اپنے بھتیجے کو لے کر آگ میں کود گئی،لیکن آگ نے ہولیکا کو جلایا اور پر اہلاد،زندہ رہا، اس لیے ہندولوگ اس واقعہ کو یادگار کے طور پر مناتے ہیں اور یہ پیغام دیتے ہیں کہ اس دن نیکی کی فتح اور برائی کو شکست ہوئی تھی۔[۹۹] گنیش پوجا اور کرشن جینتی کو بھی تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔

حوالے وحواشی

۱۔ محمد شارق سلیم (حافظ) ہندودھرم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ،قرطاس پبلشرز کراچی۔۲۰۱۱ء،ص:۲۶

۲۔ Jawahar lal Nehru,The Discovery of India oxford University press,1946-P.74

۳۔ سوامی سرسوتی،The Univercel wey of life،بھارتیہ ودیا بھاون،ممبئی،ص:۵۴

۴۔ ایضاً

۵۔ مودودی،سید ابوالاعلیٰ،الجہاد فی الاسلام،ادارہ ترجمان القرآن،۱۸۸۱ء،ص:۳۳۱

۶۔ Johan Clork Archer,The Great Religion at Modern world,P.24

۷۔ الجہاد فی الاسلام،ص:۳۳۰

۸۔ ایضاً

۹۔ Dr Radha Krishnan,The Hindus view of life,London ,1980.p.2

۱۰۔ Dr Radha krishnan,indian philosophy ,vol.1,P.453

۱۱۔ ہندومت ایک تحقیقی مطالعہ،مقالہ نگار محمد جہانگیر تیمی بحوالہ Jawahar lal Nehru an Autubiography

۱۲۔ نظامی،خواجہ حسن دہلوی کرشن جیون،دلی پرنٹنگ،ورکس (دہلی) ۱۹۲۳ء،ص:۲-۳

۱۳۔ Indian philosophy p.453

۱۴۔ ایضاً،ص:۲۰۲

۱۵۔ Dr.Radha krishnan,Easterm Religions western Thought.p.10

۱۶۔ سوامی،وویکانند،ہندودھرم ایک عالمی لیکچر،شکاگو امریکہ،۱۸۹۳ء،ص:۱۰

۱۷۔ ہندومت ایک تحقیقی مطالعہ،مقالہ نگار جہانگیر تیمی،بحوالہ (Discovery of Indian p.530)

۱۸۔ Nirad C,Chaudhri,Hinduism,New York Oxford University

Press.1979-P2

۱۹۔ ہندومت،ایک تحقیقی مطالعہ،بحوالہ(Discovery of India.P530)

۲۰۔ ہندودھرم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ،ص:۲۷،بحوالہ ہندوازم،ڈاکٹر گووند داس گپتا،ص:۲۰

۲۱۔ ڈاکٹر لیبان،تمدن ہند،ص:۱۴۴

۲۲۔ Discvery of India.P77

۲۳۔ اس کے علاوہ ہندو مذہب میں زمانے کے چار دور ہیں،ایک ست یگ،دوسرا ترتا یگ،تیسرا دواپر یگ،چوتھا کل یگ،جس وقت کل یگ تمام ہوتا ہے۔پھر از سر نوست یگ آتا ہے اور اس طرح کل یگ تک منتھا ہوتا ہے۔غرض دنیا کی حالت ہمیشہ اس طریقہ پر رہتی ہے۔اس کی ابتداء وانتہاء کچھ بھی نہیں ست یگ سترہ لاکھ اٹھائیس ہزار سال کا مشہور ہے،ترتا یگ کے ایام کا شمار بارہ لاکھ چھیانوے ہزار سال ہے۔دواپر یگ اس کی میعاد آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار سال ہے۔کل یگ کی مدت چار لاکھ دو ہزار سال ہے۔(ہندو مذہب کی معلومات،خواجہ حسن نظامی دہلوی،۱۹۲۷،ص:۲۶ تا ۲۷

۲۴۔ مقالہ برائے پی ایچ ڈی،اسلامی اور ہندو معاشرہ،موازنہ اور تنقیدی جائزہ،مقالہ نگار،حسین فاروق نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد،۲۰۰۷ء،ص:۲۶۴

۲۵۔ ترپاٹھی،رماشنکر،تاریخ قدیم ہندوستان،مترجم،سید سخی حسن نقوی،سٹی بک پوائنٹ کتاب مارکیٹ اردو بازار کراچی،۲۰۰۵ء،ص:۱۲

۲۶۔ ایضاً،ص:۲۰۔۲۱

۲۷۔ اسلام اور ہندو معاشرہ،موازنہ اور تنقیدی جائزہ،ص:۲۶۵

۲۸۔ رماشنکر ترپاٹھی،ص:۲۴

۲۹۔ جالندھری،عبدالقیوم(مفتی)منو کا قانون اور اسلامی قانون،ناشر،سید محبوب عالم لٹن روڈ لاہور،۱۹۶۸ء،ص۹۔
۱۰۔ڈاکٹر سر جان مارشل نے ان شہروں کے حالات بڑی تحقیق اور تفصیل سے لکھے ہیں:
ایشور ٹوپا اپنی کتاب ہندوستان تمدن میں دراوڑی قوم کے متعلق لکھتے ہیں:دراوڑی قوم کون اور کہاں سے آئی تھی؟ان سوالات کا تشفی بخش جواب ابھی نہیں دیا جاسکتا۔اس قوم کا تعلق آریائی قوم سے مطلق نہ تھا۔ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ یہ قوم مغرب کی طرف سے آئی اور شمالی ہندوستان آئے،تیسری رائے یہ ہے کہ یہ قوم ایک ہندی قوم ہے جو جنوبی ہند میں آباد ہے۔اور جس کا آبائی وطن ہندوستان ہے،البتہ مشہور رائے یہ ہے کہ یہ قوم باہر سے ہندوستان آئی۔اسی مصنف نے لکھا ہے:دراوڑی تمدن اور تہذیب کا ارتقاء آج سے کوئی ۳ یا ۴ ہزار برس پیشتر ہوا۔بعض اس کو ہزار سال پہلے بتاتے ہیں۔الغرض دراوڑی تمدن و تہذیب کی قدامت انسانی ترقی کی ایک بے مثال یادگار ہے۔(ایشور ٹوپا،ہندوستانی تمدن،حیدرآباد،بک ڈپو،حیدرآباد دکن،۱۹۴۳ء،ج۱،ص۱۲۔۱۳)

۳۰۔ رماشنکر ترپاٹھی،تاریخ قدیم ہندوستان،ص۲۲۔مفتی عبدالقیوم جالندھری لکھتے ہیں کہ یہ قوم اس ملک کی قدیم قوم

نہیں۔وسط ایشیا کی ایک بہت بڑی قوم تھی،اس کے چند خانہ بدوش قبائل جھیل ارل کے قریب رہتے تھے، یہ لوگ تعمیر کے فن سے واقف نہ تھے۔کاشت کاری کی غرض سے اجتماعی زندگی بسر کرنے جھیل ارل کے علاقہ میں ایسی چراگاہیں نہ تھیں جوان کے مویشوں کے لیے کافی ہوں اس لیے یہ لوگ قریباً دوہزار سال قبل مسیح میں پہاڑوں سے گزر کر سب سے پہلے سندھ میں داخل ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب بابل کے علاقے میں بادشاہ نمرود کے دارالسلطنت شہرعود سے حضرت ابراہیمؑ آگ سے محفوظ رہ کر کنعان فلسطین اور مصر وحجاز کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔(منوکا قانون اوراسلامی قانون،ص:۱۰)

۳۱۔ Marchal,Sir Johan The Prehistoric Civilization of the Indus,Princeton University Press-1977-P1

۳۲۔ رماشنکر تر پاٹھی،تاریخ قدیم ہندوستان،ص:۲۰

۳۳۔ ول ڈیورانٹ، ہندوستان،مترجم رشید طیب،تخلیقات علی پلازہ مزنگ روڈ لاہور،ص:۱۱۰

۳۴۔ ایشوراٹوپا، ہندوستانی تمدن،اعظم اسٹیم پریس حیدآباد دکن ۱۹۴۳ء، ج اول ص:۱۷

۳۵۔ ایضاً ص:۱۴

۳۶۔ ایضاً ص:۱۳۔۱۴

۳۷۔ ایضاً ص:۱۵،۱۶

۳۸۔ ایضاً ص:۱۶

۳۹۔ ایضاً ص:۱۶۔۱۷

۴۰۔ ایضاً ،ص:۱۷

۴۱۔ ایضاً ص:۱۸

۴۲۔ رماشنکر تر پاتھی،تاریخ قدیم ہندوستان،ص:۳۳

۴۳۔ خواجہ حسن نظامی نے لکھاہے کہ آریہ قوم دریائے سندھ سے گنگا تک آئیں اوراس کے بعد برہم پتر تک پھیل گئیں ۔راہ میں انہوں نے سیاہ فام اورسیدھے بال والی اقوام کوجوان سے پہلے یہاں مقیم تھے زیر کیا اور بتدریج ہند کی سرزمین پر بس گئی۔کرشن بیتی،ص:۶

۴۴۔ رماشنکر تر پاٹھی،قدیم تاریخ ہندوستان،ص:۳۳

۴۵۔ ایران سے قدیم زمانے کے بعض کتبے ایسے دریافت ہوئے ہیں جن میں ایرانی بادشاہ کے ساتھ لفظ ''آریہ'' لکھا ہواہے،شاہ گستاشپ۔اس طرح ایرانی، آریہ اور ہندی آریہ کے باہم تعلقات کی شہادت چھٹی صدی قبل مسیح کے اس واقعہ سے بھی ملتی ہے کہ جب ایران میں زرتشت کا ظہور ہواتو وہاں کے قدیم مشرکانہ مذہب میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔یہ بعینہ وہی مذہب تھا جیسے آریہ ہندوستان لائے تھے۔(ہندودھرم اوراسلام کا تقابلی مطالعہ،ص:۳۴)

۴۶۔ اسلام اور ہندومعاشرہ،موازنہ اورتنقیدی جائزہ،ص:۲۶۷

۴۷۔ ایضاً،ص:۲۶۸

۴۸۔ سوم ایک مشروب کا نام ہے،اس کا رس ویدی دور میں مقدس مشروب کے طور پر قربانی اور دوسرے موقعوں پر استعمال ہوتا تھا۔ایضاً،ص:۲۶۹

۴۹۔ ایضاً،ص:۲۶۸۔۲۶۹

۵۰۔ ایضاً،ص:۲۶۹

۵۱۔ ہندو دھرم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ،ص:۴۱۔۴۲

۵۲۔ ایضاً،ص:۴۷۔۴۸

۵۳۔ ایضاً،ص:۴۹۔۵۰

۵۴۔ ایضاً،ص:۵۶

۵۵۔ سوامی،دیانند سرسوتی،رگ وید ایک مطالعہ،ص:۱۵

۵۶۔ اپنشد اردو،ترجمہ شنکر بھاشیہ،مقدمہ نگارشات پبلشرز لاہور،وہ کونسی گمراہی تھی جسے دور کرنے کے لیے وید،گیتا مہابھارت اور دیگر کتب مقدسہ کا نزول ہوا؟ وید مقدس جن حضرات پر نازل ہوئے۔ان کا چال چلن کیسا تھا،ان کی قومیت کیا تھی،نسبت کیسی تھی اس بارے میں کوئی بھی بات نہیں ملتی ہے۔

۵۷۔ محمد یوسف،(شیخ) آریہ مذہب کی حقیقت،ادارہ تحقیقات مذاہب،۱۹۲۳ء،ص:۳۳

۵۸۔ ایضاً،ص:۳۴۔۳۵

۵۹۔ اسلام اور ہندو دھرم کا تقابلی مطالعہ،ص:۸۴

۶۰۔ بیرونی ابوریحان،تحقیق کتاب ماللہند،ص:۷۰

۶۱۔ نہرو،جواہر لال،تلاش ہند،ص:۹۵۔۹۶

۶۲۔ ایضاً

۶۳۔ ہندو دھرم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ،ص:۹۶

۶۴۔ تاریخ قدیم ہندوستان،ص:۳۴

۶۵۔ اسلامی اور ہندو معاشرہ موازنہ وتنقیدی جائزہ،ص:۳۲۵

۶۶۔ ہندو دھرم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ،ص:۹۱

۶۷۔ ایضاً،ص:۹۲

۶۸۔ داس گپتا،ہسٹری آف انڈین فلاسفی،ص:۱۸

۶۹۔ ہندو دھرم اور اسلام کا تقابلی مطالعہ،ص:۹۲

۷۰۔ ایضاً،ص:۹۳

۷۱۔ ایضاً،ص:۹۳۔۹۵

۷۲۔ اسلامی اور ہندو معاشرہ،موازنہ وتنقیدی جائزہ،ص:۳۲۸۔۳۲۹۔(بحوالہ داس گپتا،ہسٹری آف انڈیا،ص:۱۸)

۷۳۔ ایضاً،ص،بحوالہ داس گپتا، ہسٹری آف انڈیا،ص:۲۰

۷۴۔ ایضاً،ص۳۳،بحوالہ داس گپتا، ہسٹری آف انڈیا،ص:۴۲

۷۵۔ Discovery of India. P.78

۷۶۔ Radha Krishnan Eastem Religions and western Thought.P.122

77- Discovery of India.P78

۷۸۔ اسلامی اور ہندو معاشرہ ،موازنہ وتنقیدی جائزہ،ص:۳۳۱(بحوالہ Book of Indian Philosoph) P.37

۷۹۔ ول ڈیورانٹ، ہندوستان،ص۳۳۔واضح رہے کہ شاہجہاں کے بڑے بیٹے دارشکوہ نے اپنشدوں کا فارسی زبان میں ترجمہ سراکبر کے نام سے کرایا تھا۔۱۸۰۱عیسوی میں ''اکنیٹیل'' نے اس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

۸۰۔ ایضاً

۸۱۔ اسلامی اور ہندو معاشرہ! موازنہ وتنقیدی جائزہ،ص۳۳۲۔(بحوالہ اموبہ رنجن،مہاپتر،فلسفہ مذاہب ص۱۶۳)

۸۲۔ بیرونی کتاب الہند،ص:۴۷

۸۳۔ اسلامی اور ہندو معاشرہ: موازنہ وتنقیدی جائزہ،ص:۳۳۷۔۳۳۸

۸۴۔ مہابھارت میں قدیم ،فرسودہ سماجی زندگی کا عکس نمایاں ہے۔جوکہ زندگی کے چار مقاصد،زندگی کے چار حصے اور معاشرے کے چار طبقات پر مشتمل ہے وہ درج ذیل ہیں۔پروسارتھا یعنی راستبازی،دھرم،دولت یا ارتھ،کام یا مادی لذت اور نجات یا موکش(اسلامی اور ہندو معاشرہ موازنہ وتنقیدی جائزہ،ص:۳۳۹)

۸۵۔ ایضاً،ص:۳۴۱۔(بحوالہ ہند،مولانا امیر حمزہ، ہندو کا ہمدرد،ص:۱۵۲)

۸۶۔ More A C Source,Book at Indian Philosophy.P:100

۸۷۔ اس بات کی شہادت نگیندر را کمار سنگھ کے لکھے ہوئے ایک تحقیقی مضمون سے بھی ملتی ہے۔پرانوں کے متعلق اولین حوالہ چندوگیا اپنشد میں مذکور ہے۔پانچ سو قبل مسیح پر اہدران یا......کا اپنشد میں پرانوں کو پانچواں وید کہا گیا ہے۔ اسی طرح گیتار کے مطابق پرانوں کی تدوین کی اصلی وحقیقی تاریخ ویدوں کی حتمی تدوین ہی کے ہم زمانہ تھی۔پرانوں کے مکتوبات کی تاریخ وتدوین سے متعلق ہندو مذہبی پیشوا شدید مختلف الخیال ہیں۔(جہات الاسلام،ج۹،شمارہ۱،۲۰۱۵ء،مضمون ہندومت میں پران تعارف وتجزیہ،مضمون نگار،حافظ زاہد لطیف،محمد عبداللہ، ص:۲۶۷۔۲۶۸)

۸۸۔ پرانوں کی کل تعداد اٹھارہ ہے جو درج ذیل ہیں:

(۱) آدی پران،یعنی سب سے پہلی — (۲) میتا(مچھلی)پران۔

(۳) کرما(کچھوا)پران۔ — (۴) وراہا(سور)پران۔

(۵) نرسمہا یا شیر کے سر والے انسان کا پران — (۶) وامن(بونا)پران۔

(۷) وایو یا ہوا کا پران — (۸) نندا پران جو کہ مہادیو کے خادم کے اوپر ہے۔

(۹) سکند پران جو کہ مہادیو کے بیٹے کے نام پر ہے۔

(۱۰) آدتیہ (سورج) پران۔ (۱۱) سوما (چاند) پران۔

(۱۲) سامبا یونی۔ وشنو کے بیٹے کا پران (۱۳) برہمانڈ، (آسمان) پران

(۱۴) مارکنڈیہ پران (۱۵) تارکشیہ پران جو ہما پرندے کے نام پر ہے

(۱۶) وشنو پرانؒ (۱۷) برہما پران

۱۸۔ بھوشیہ (مستقبل کا) پران۔ (اسلام اور ہندو معاشرہ کا تنقیدی جائزہ، ص۳۴۳۔۳۴۴)

۸۹۔ ایضاً، ص:۲۶۸

۹۰۔ ایضاً، ص:۲۶۹

۹۱۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ابتداء میں شنکراچاریہ کے ایک شاگرد یادو پرکاش کا چیلا بنا۔ تاہم بعد میں استاذ سے بعض مسائل میں اختلاف کی بنیاد پر جمنا منی کا شاگرد بن گیا، اس کی وفات کے بعد اس کا جانشین مقرر ہوا اور پھر اپنے نظریات کی اشاعت کر کے سرس وسمپر دائے کی بنیاد رکھی۔

چوہدری غلام رسول، مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ، ص:۱۹۷

۹۲۔ رمانج کے پیروکار وشنو اور لکشمی کی پرستش اصلی صورت میں یا اوتار کی صورت میں کرتے ہیں۔ دونوں درجات میں تفاوت ضرور پایا جاتا ہے۔ تاہم پوجا کے لحاظ سے دونوں یکساں قابل احترام تسلیم کئے جاتے ہیں۔ وشنو اور لکشمی کی وجہ سے ان کے مزید فرقے بھی ہیں۔ جن میں بعض مذکر اور بعض مؤنث کی عبادت کرتے ہیں۔ لکشمی نارائن، رام اور سیتا کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس کے پیروکار کھانا پوشیدگی میں پکا کر کھاتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے کھانے پر کسی کی نظر پڑنے سے سارا کھانا ناپاک ہوجاتا ہے۔ اسلامی اور ہندو معاشرہ: موازنہ وتنقیدی جائزہ، ص:۴۷۷۔ بحوالہ پروفیسر بی بی رائے، سمپر دائے، ص:۲۵۔۲۸

۹۳۔ اس فرقے کے لوگ ہمیشہ برہمن اور بیراگیوں میں سے ہوتے ہیں۔ اور تجرد کی زندگی گزارتے ہیں، تقریباً ہر ذات کے ہندو اس فرقے سے منتر لیتے ہیں۔

۹۴۔ اس فرقے کے لوگ دن میں آٹھ مرتبہ کرشن جی کی سیوا کرتے ہیں اور کئی سالانہ تہوار مناتے ہیں۔ جن میں رتھ یاترا، راس جاترا اور جنم اشٹمی زیادہ مشہور ہے۔ پیشانی پر دو کھڑی لکیر کھینچتے ہیں جنھیں ناک کی جڑ میں لا کر نیم چاند کی صورت میں ملا دیتے ہیں۔ دونوں لکیروں کے درمیان ایک گول لال ٹیکہ بھی لگاتے ہیں۔ دونوں بازوؤں اور سینے پر سنکھ چکر وغیرہ کا چھاپہ لگاتے ہیں۔ گلے میں تلسی کی کنٹھی اور ہاتھ میں تلسی کا مالا جپا کرتے ہیں، آپس میں نمسکار کرتے وقت کرشن اور جے گوپال کی بولی بولتے ہیں۔ ایضاً، ص:۴۷۸۔ (بحوالہ پروفیسر بی بی رائے۔ سمپر دائے، ص:۹۲ تا ۹۷)

۹۵۔ ایضاً، بحوالہ سمپر دائے، ص:۱۰۷

۹۶۔ اس تہوار کے منانے کی وجہ ہندو علماء بتاتے ہیں کہ دیوتاؤں نے جنوں کے بادشاہ 'مابیشتر' سے خطرہ محسوس کیا کہ عنقریب ان پر حملہ آور ہوگا۔ اس وجہ سے انہوں نے مل کر طے کر لیا کہ ایک زور آور دیو بنائیں۔ تاکہ وہ جنوں کے

بادشاہ کا مقابلہ کرسکے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں برہما کے منھ سے ایک تیز روشن نکیل جس سے دس ہاتھ والی حسین وجمیل درگا دیوی وجود میں آ گئی، ہر طرح کے ہتھیاروں سے لیس تھی۔ درگا دیوی جنوں کے بادشاہ کے پاس چلی گئی تو بادشاہ نے شادی کی پیشکش کی، اس پر درگا نے یہ شرط لگائی کہ مجھے لڑائی میں شکست دیکر مجھ سے شادی کرسکتے ہو۔ جنوں کا بادشاہ راضی ہوگیا، دونوں کے مابین جنگ ہوئی، جس میں درگا دیوی نے اس کے بھنس اور سالار اعلیٰ 'رکتا بیجا' کو شکست دی۔ اس فتح کی خوشی میں یہ تہوار منایا جاتا ہے۔ اسلامی اور ہندو معاشرہ: موازنہ وتنقیدی جائزہ، ص: ۴۸۰

۹۷۔ شوراتری کا تیوہار اس طرح منایا جاتا ہے کہ 'لنگا جی' کو گانے کے پانچ مقدس اشیاء دودھ، لسی، پیشاب، مکھن اور گوبر سے اشنان کرایا جاتا ہے، ان اشیاء کو 'پنجا گاؤ' کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ پانچ کھانے کی اشیاء جنہیں ابدیت کھانا کہا جاتا ہے وہ پیش کئے جاتے ہیں۔ وہ یہ ہیں: دودھ، گھی، دہی، شہد اور شکر، اس دن فجر کے وقت سے مندروں کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں اور لنگا جی کی عبادت ہوتی ہے۔ اس دن رات کو برت رکھا جاتا ہے۔ اور ساری رات شیوجی کی مورتی اور گنگا جی کے سامنے منتر پڑھ کر پوجا ہوتی ہے۔ ایضاً ص: ۴۸۱۔ (بحوالہ ہندوؤں کا ہمدرد، ص: ۲۱۶)

۹۸۔ تفصیل کے لیے دیکھئے، ایضاً ص: ۴۸۱

۹۹۔ ایضاً ص ۴۸۲

عصرِ حاضر میں مخلوط تعلیمی نظام اور اسلامی تعلیمات

محمد اسامہ

■■■

محمد اسامہ *

عصرِ حاضر میں مخلوط تعلیمی نظام اور اسلامی تعلیمات

اسلام نے آغاز ہی سے علم کے حصول کی تاکید کی ہے، کیوں کہ علم انسان کو اس کی زندگی کے مقصد سے آگاہ کرتا ہے، اسے نیکی و بدی کی تمیز سکھاتا ہے اور حیوانوں سے ممتاز بناتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالی نے قرآن کریم کی پہلی آیتیں علم سے متعلق نازل کی ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

> ''پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔'' [۱]

مختلف احادیث میں بھی علم حاصل کرنے اور اس کو پھیلانے کی تاکید کی گئی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔'' [۲]

* گیسٹ فیکلٹی، ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئ دہلی۔۲۵ ای میل: usama9911@gmail.com

قرآن وسنت کی اس قدر تاکید کے باوجود بھی امت مسلمہ نے علم کے حصول کو برسہا برس سے جتنا نظر انداز کیا ہے، اتنا کسی نے نہیں کیا۔ پہلے تو علم کو دینی اور دنیوی علوم میں تقسیم کیا گیا اور پھر دونوں ہی میں پیچھے ہوتے چلے گئے۔ ایسا نہیں ہے کہ مسلمان دینی علوم میں غیر معمولی طور پر مشغول ہیں اور اس وجہ سے دنیوی علوم پر توجہ نہیں دے پا رہے ہیں، بل کہ جب سے دنیوی علوم کی طرف سے غفلت برتی گئی ہے، تب ہی سے دینی علوم میں زوال آیا ہے۔ اسی وجہ سے مسلمان نہ صرف پس ماندگی کا شکار ہیں بل کہ غیروں پر مکمل طور سے منحصر ہو چکے ہیں اور تعلیمی میدان میں دوسروں کے نظرِ کرم کے محتاج بھی ہیں۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق مسلمانوں کے 4% لڑکے لڑکیاں مدرسہ میں، سرکاری اسکولوں میں 66%، پرائیوٹ اسکولوں میں 30% تعلیم حاصل کرتے ہیں اور 14-6 سال کی عمر کے 25% لڑکے لڑکیاں یا تو اسکول ہی نہیں گئے یا بیچ ہی میں تعلیم کو خیر آباد کہہ دیا ہے۔ مجموعی طور سے دیکھا جائے تو مردوں کی شرح خواندگی 66% اور عورتوں کی شرح خواندگی 50% ہے۔[۳]

اس رپورٹ سے ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان تعلیم نسواں کی طرف سے غافل ہیں، جب کہ لڑکیوں کی تعلیم اس وجہ سے زیادہ ضروری ہے کہ ان کی گود میں نئی نسل پروان چڑھتی ہے۔ اور اگر مائیں ہی تعلیم وتربیت سے محروم ہوں گی تو وہ اپنے بچوں کی صحیح تربیت کس طرح سے کر سکیں گی؟ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اگر ایک مرد کو تعلیم دی تو ایک فرد کو تعلیم دی لیکن اگر ایک عورت کو تعلیم دی تو ایک پورے خاندان کو تعلیم دی۔ مسلم معاشرے میں لڑکیوں سے متعلق تعلیمی بیداری آئی ہے، لیکن مخلوط تعلیمی نظام نے اس کی رکاوٹ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مخلوط تعلیم کی تعریف، تاریخ، آغاز، فوائد ونقصانات اور اہل علم ودانش کی آراء وغیرہ کا جائزہ لیا جائے، پھر اس حوالے سے اسلامی تعلیمات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے آخر میں مسئلہ کا حل تلاش کیا جائے۔

مخلوط تعلیم کی تعریف

دی انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا (The Encyclopedia Britannica) میں مخلوط تعلیم کی تعریف ان الفاظ میں ہے:

"Co-Education, the term applied to the

instruction and training of boys and girls, or of young people of both sexes, in the same school or institution, in the same classes and through the same courses of study."[۴]

یعنی مرد اور عورت ایک ساتھ تعلیم حاصل کریں، کسی کی فوقیت اور کسی کی کم تری کا سوال نہ ہو، مکمل طور سے مساوات ہو، اساتذہ اور منتظمین کی جانب سے کوئی خصوصی رعایت نہ ہو، نہ ہی علیحدہ کلاس، کورس، نشست، کامن روم، ہاسٹل وغیرہ ہوں اور نہ ہی ساتھ کھیلنے کودنے بیٹھنے پر کوئی پابندی ہو۔

مخلوط تعلیم کی تاریخ

اگر مخلوط تعلیم کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ابتدائی دور میں اس کا رواج نہیں تھا اور شاذ و نادر ہی کہیں اس کی مثال ملے گی، مثال کے طور پر افلاطون (Plato, 428BC-347BC) نے سب سے پہلے عورتوں کو مردوں کے مساوی قرار دیتے ہوئے انہیں بھی علمی میدان میں شامل کیا۔ اس حوالے سے اس نے اپنی کتاب ''دی ری پبلک'' (The Republic) میں اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ خواتین کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے تعلیم میں مردوں کے ساتھ شریک ہوں۔[۵] پھر ٹیوس (Teos) کے تعلیمی اوقاف نے ادب کے پروفیسروں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ طلبہ اور طالبات کو مشترک تعلیم دیں۔ یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ زمانہ قدیم کے رومن اسکولوں میں مخلوط تعلیم دی جاتی تھی یا نہیں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ کیپوا (Capua) کے ایک مقبرہ میں ایک اسکول ماسٹر کا بت دریافت ہوا ہے جس کے ایک طرف لڑکا کھڑا ہے اور دوسری طرف لڑکی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی مخلوط تعلیمی نظام کا رواج کم و بیش پایا جاتا تھا۔ اسی طرح اس نظام کی ایک ابتدائی شکل یہ بھی تھی کہ بڑے خاندانوں کے ''گھریلو اسکولوں'' میں بھی لڑکے اور لڑکیوں کو مشترکہ تعلیم دی جاتی تھی۔ اس نظام کا تجربہ آغاز میں ابتدائی اور ثانوی کلاسوں میں کیا گیا، پھر اعلیٰ کلاسوں میں بھی یہی نظام رائج ہو گیا۔ بہر حال سترہویں صدی کی ابتدا سے ہی مخلوط تعلیمی نظام کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا اور اسے اسکاٹ لینڈ، ہالینڈ، سویڈن، ڈنمارک، ناروے، انگلینڈ اور متحدہ امریکہ سمیت کئی مغربی ممالک نے

اختیار کر لیا تھا۔

مخلوط تعلیمی نظام کو اس وجہ سے بھی ترقی ملی کہ پروٹسٹنٹ تحریک کے بانی مارٹن لوتھر[۶] (Martin Luther) اور بعض دیگر مصلحین نے تاکید کی کہ لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کو بھی بائبل کی تعلیم دی جائے اور اسی سے پھر متعدد ابتدائی اسکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کو مخلوط تعلیم دینے کا رجحان پیدا ہوا۔ نیز اس نظام کو بڑھاوا دینے میں پیتالوزی[۷] (Johann Heinrich Pestalozzi) کے اس نقطہ نظر نے بھی اہم کردار ادا کیا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے تمام تعلیمی اداروں کو خاندان اور گھر کی مشابہ بنا دیا جائے۔ اسی طرح مخلوط تعلیمی نظام کو فروغ دینے میں ایک یہ بھی دلیل دی گئی کہ لڑکے اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ اسکول قائم کرنے اور اس کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے میں زیادہ خرچ ہوگا اور اس کے مقابلے میں اگر ایک ہی اسکول میں دونوں کو تعلیم دی جائے تو کم خرچ آئے گا۔ مزید برآں چوں کہ عوام میں تعلیم کا رجحان بڑھتا جا رہا تھا اور حکومتوں کے لیے الگ الگ اسکول کھولنے کے بجائے ایک ہی اسکول دونوں کے لیے قائم کرنا زیادہ آسان تھا۔[۸]

مخلوط تعلیمی نظام کو مزید جلا اس وقت ملی جب اٹھارہویں صدی کے اواخر میں مغربی معاشرے میں صنعتی انقلاب (1760) آیا اور اس سے متاثر ہو کر عورت بھی معاشی میدان میں اتر آئی، لیکن اس میں اپنا مقام بنانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ بھی مردوں کی طرح وہی تعلیم حاصل کرے، جو مرد کر رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ نظام مختلف پہلوؤں سے نقصان دہ ہے، چنانچہ روس اور اسرائیل سمیت متعدد ممالک نے مخلوط تعلیمی نظام کا تجربہ کرنے کے بعد بعض درجوں پر اسے ترک کیا ہوا ہے اور انہوں نے اسے تعلیم کی ہر منزل بالخصوص ثانوی کلاسوں میں رائج نہیں کیا ہے، کیوں کہ اس وقت طلبہ و طالبات اپنی نشو نما میں نفسیاتی لحاظ سے ایسے مرحلے میں ہوتے ہیں جہاں ذہنی و جذباتی پختگی کے بجائے ہیجانی کیفیت کا غلبہ ہوتا ہے۔

حامیوں کے دلائل کا تجزیہ

مخلوط تعلیمی نظام کے حامیوں کی پہلی دلیل یہ ہوتی ہے کہ زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ عورتوں کو ترقی کی دوڑ سے علیحدہ کر دیا جائے۔ جو قومیں ترقی کر رہی ہیں وہاں مرد اور عورت شانہ

بشانہ کام کر رہے ہیں اور ہم اپنی نصف آبادی کو گھروں میں قید کر کے ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں کھڑی کر سکتے ہیں۔ اب وہ زمانہ گیا کہ عورتیں محض بچے پیدا کریں اور گھروں میں قید رہیں، بل کہ انہیں معاشرے کی ترقی میں بھرپور حصہ لینا ہے۔ اسی طرح جمہوری نظام نے بھی مساوات مردوزن کا نعرہ بلند کیا کہ عورتوں کا بنیادی حق ہے کہ انہیں مردوں کی طرح تعلیم میں بھی یکساں مواقع ملیں، تا کہ وہ بھی ہر میدان میں خود کو مردوں کے برابر ثابت کر سکیں اور اس کے لیے مخلوط تعلیم کا ہونا ضروری ہے، لیکن مخلوط تعلیم کے پیچھے مساوات مردوزن کا یہ نظریہ بالکل بے بنیاد ہے۔ مساوات کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ صلاحیتوں اور ذمہ داریوں سے قطعِ نظر سب کو برابر اور ہر طرح سے مساوی قرار دیا جائے۔ ایک جھاڑو لگانے والے اور ایک پروفیسر کی تنخواہ برابر نہیں ہوسکتی، باوجود اس کے کہ دونوں ہی انسان ہیں۔ مساوات کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ سب کو اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کوشش کرنے اور معاشرے میں اپنا مقام بنانے کے لیے برابری کے مواقع حاصل ہوں اور ہر ایک کو وہ مقام ملے جس کا وہ مستحق ہے، نیز مرد اور عورت بہ حیثیت انسان تو مشترک ہیں، مگر جسمانی ساخت، مزاج، نفسیات اور فرائض و ذمہ داریوں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو آخر کس طرح دونوں ایک جیسی تعلیم کے مستحق ہو سکتے ہیں؟

مخلوط تعلیمی نظام کے حامیوں کی دوسری دلیل یہ ہوتی ہے کہ تعلیم صرف مختلف کتابوں کو پڑھ کر امتحان پاس کر لینے ہی کا نام نہیں ہے، بل کہ افراد کے کردار کی نشوونما اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے تجربات حاصل کرنے کا نام ہے۔ اس لیے تعلیمی اداروں میں گھر جیسا یا بھائی بہن کی طرح کا ماحول ضروری ہے، جو مخلوط تعلیم ہی فراہم کرتی ہے۔ پستالوزی کے مطابق تعلیم زندگی کی تیاری ہے، اس لیے اس کا ماحول زیادہ سے زیادہ قدرتی اور گھریلو ہونا چاہیے اور لڑکے لڑکیوں کو علاحدہ رکھنا، ان کو چوری چھپے ملنے اور گم راہی کی طرف لے جانے کا ذریعہ ہوتا ہے، لیکن یہ بھی ایک عجیب و غریب نظریہ ہے کہ پہلے تو عورتوں کو گھر سے نکال باہر کر کے گھر کا ماحول ختم کر دیا جائے اور پھر یہ امید کی جائے کہ یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں میں گھر کا ماحول فراہم ہوگا۔ گھر میں والدین، بھائی بہن اور دیگر رشتے داروں میں حرمت اور پاکیزگی کے رشتے ہوتے ہیں جب کہ اسکولوں میں ایسا نہیں ہوتا ہے کیوں کہ عمر کے ساتھ ساتھ جنسی امتیازات، جذبات اور مختلف طبعی و نفسیاتی ردعمل پیدا ہوتے ہیں، چنانچہ وہاں گھر کا ماحول پیدا ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ عورتوں کو مردوں کی طرح پڑھانے اور تعلیم یافتہ بنانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ان سے بھی مردوں کی طرح ملازمت کرائی جائے تا کہ فی الواقع وہ ترقی ہو سکے جس کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو پھر مخلوط تعلیم کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا اور اگر اس پر عمل کیا گیا تو اس صورت میں گھر کا پورا نظام بگڑ جائے گا اور ایسا ہو بھی رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بچے ماں کے بجائے نوکرانی اور آیا کی گود میں پرورش پائیں گے، وہ کس طرح کے ہوں گے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ افلاطون نے مخلوط تعلیم کی حمایت تو کی تھی مگر اس نے ایک ایسے معاشرے کا نقشہ پیش کیا تھا جس میں خاندانی نظام کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ تھا۔

مخلوط تعلیمی نظام کے حامیوں کی تیسری دلیل یہ ہوتی ہے کہ ایک ایسا ملک جو غریب ہو اور وہ تعلیم پر بہت زیادہ پیسہ خرچ نہیں کر سکتا ہے تو مخلوط تعلیم میں اسے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ دونوں کے لیے ایک ہی اسکول کھولنا کافی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے کم نہیں ہے اور سب ان کی تعلیمی ضرورت کے قائل ہیں تو کیوں وسائل کی کمی کا رونا رویا جائے؟ جب مرد عورت کو ایک دوسرے کے مساوی قرار دیا جا رہا ہے تو عورتوں کی تعلیم پر روپے خرچ کرنے میں کیا قباحت ہے؟ آخر صنف نازک کا کیا گناہ ہے کہ ان کی تعلیم کو کفایت کے نام پر قربان کر دیا جائے؟ اور ایک ایسے ماحول میں ان کو تعلیم دی جائے جہاں ان کا استحصال اکثر و بیشتر ہوتا رہتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ متعدد لڑکیوں کا تعلیمی سلسلہ اس لیے منقطع ہو گیا کہ انہیں مخلوط تعلیمی نظام میں نہیں پڑھنا تھا۔ اس کی واضح مثال حال ہی میں کرناٹک کے ایک کالج میں مسئلہ حجاب کی ہے، جس کی وجہ سے متعدد طالبات نے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا ہے۔

اسلامی تعلیمات

مخلوط تعلیم کے حوالے سے قرآن وسنت میں متعدد ہدایات موجود ہیں، البتہ اس سلسلے میں کوئی عمومی حکم نہیں ہے جسے ہر طرح کے حالات میں لاگو کیا جا سکے، یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے اس میں لچک رکھی ہے، نیز اسے وقت اور ماحول پر چھوڑ دیا ہے کہ اختلاط کی کس حد تک ضرورت ہے؟ وہ مقاصد کیا ہیں جس کے لیے اختلاط ضروری ہے؟ کیا ماحول اس کی اجازت دے رہا ہے؟ اور اگر ہاں تو اس کے فوائد اور نقصانات کیا ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح اسلام نے مردوں اور عورتوں کے بعض

بنیادی شرعی حدود متعین کر دیے ہیں جن کی پاس داری دونوں کے لیے لازمی ہے، جیسے دونوں کے لیے غض بصر کا حکم، عورت کو ساتر لباس پہننے کا حکم، نیز اسے ہتھیلی اور چہرہ کے علاوہ باقی تمام جسم کو ڈھکنے کا حکم (بعض فقہاء چہرے کے پردے کے بھی قائل ہیں)، گفتگو میں وقار و متانت اور سنجیدگی برقرار رکھنے کا حکم تا کہ کسی شخص کے دل میں کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہو، چال ڈھال میں حیاء اور وقار کا حکم، ناز و ادا اور لبھانے والی حرکتوں سے اجتناب کا حکم، خوش بو اور شوخ رنگوں کے لباس یا میک اپ وغیرہ سے بچنے کا حکم، نامحرم کے ساتھ تنہائی اختیار کرنے سے باز رہنے کا حکم اور بلا ضرورت اختلاط سے رکنے کا حکم وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ عہد نبوی میں ہمیں دونوں طرح کی مثالیں مل جائیں گی، جیسے حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ مرد حضرات تو مستقل آپ کے ساتھ رہتے ہیں اور علم حاصل کرتے ہیں اور ہم خواتین اس سے محروم رہ جاتی ہیں، اس لیے آپ ایک دن ہمارے لیے بھی متعین کر دیں تا کہ ہم لوگ بھی آپ سے مستفید ہو سکیں۔ آپؐ نے ان کی بات مانتے ہوئے خواتین کے لیے ایک دن مقرر کر دیا۔[۹] اسی طرح آپؐ نے عورتوں کو عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن گھروں سے نکلنے کا حکم دیا کہ وہ بھی مردوں کی طرح عید گاہ نماز کے لیے تشریف لے جائیں، البتہ حیض والی خواتین نماز سے دور رہیں۔[۱۰]

درج بالا احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں خواتین کو علم کے حصول کا شوق تھا، لیکن وہ مردوں کی مجالس میں شریک نہیں ہوتی تھیں۔ اسی لیے انہوں نے آپؐ سے اپنے لیے الگ سے ایک دن مقرر کرایا۔ اسی طرح آپؐ عید کی نماز کے بعد عورتوں کے حصے میں تشریف لے گئے اور انہیں مختلف وعظ و نصیحت سے نوازا۔ اس کے برعکس ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپؐ مردوں کی مجلس میں ہوتے تھے اور بعض صحابیات آپؐ سے مسئلے مسائل دریافت کرنے آجاتی تھیں اور وہ بھی ایسے مسئلے معلوم کرتی تھیں جن سے بالعموم حیاء اور شرم آجایا کرتی ہے جیسے حیض، جنابت یا احتلام وغیرہ کے مسائل وغیرہ، لیکن آپؐ نے کبھی ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ اسی طرح بعض صحابیات دور دراز کے علاقوں میں جہاد کے لیے بھی فوج کے ساتھ جایا کرتی تھیں، جیسے صحیح بخاری اور مسلم میں روایت ہے کہ حضرت عبادہ بن صامتؓ کی بیوی ام حرامؓ نے آپؐ سے دعا کرائی تھی کہ وہ سمندری راستے سے جہاد کر سکیں۔ آپؐ نے دعا کی اور وہ قبول بھی ہوئی، چنانچہ حضرت عثمانؓ کے دور میں وہ جہاد کی غرض سے بذریعہ سمندر قبرص تشریف لے گئیں اور وہیں

ان کی وفات ہوئی۔اسی طرح متعدد جنگوں میں صحابیات نے بھی شرکت کی تھی اور وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں اور پیاسوں کو پانی پلایا کرتی تھیں۔انہیں مسجدوں میں نماز ادا کرنے کی پوری آزادی تھی۔خلاصہ یہ کہ اسلام نے اس حوالے سے افراط وتفریط سے باز رہنے کا حکم دیا ہے اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔

مخلوط تعلیمی نظام اور مختلف مفکرین

مخلوط تعلیمی نظام کے حوالے سے علماء کرام اور مفکرین دو طبقوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔ایک طبقہ وہ ہے جس نے اس نظام کو سختی سے رد کر دیا ہے، اس میں شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، شیخ محمد بن صالح عثیمین، شیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن جبرین، ڈاکٹر احمد شلبی، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور پروفیسر ثریا بتول علوی وغیرھم سرفہرست نظر آتے ہیں اور ایک طبقہ وہ ہے جس نے اسے شریعت کی بعض شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے، اس میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، ڈاکٹر محمد اکرم ندوی اور وحیدالدین خاں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہاں اس کی بھی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ مخلوط تعلیمی نظام کو قبول کرنے یا اسے رد کرنے میں بعض علماء کرام اور مفکرین نے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ آیا یہ مسئلہ مسلم ممالک والوں کو درپیش ہے یا غیر مسلم ممالک میں رہنے والے افراد کو؟ اگر غیر مسلم ممالک والوں کو ایسے نظام میں تعلیم حاصل کرنی ہے تو انہوں نے ان کے لیے بہ حالت مجبوری اسلامی شعائر کی پابندی کے ساتھ اسے جائز قرار دیا ہے اور مسلم ممالک والوں کے لیے مخلوط تعلیم سے منع کیا ہے کیوں کہ انہیں اس حوالے سے کوئی مجبوری نہیں ہے اور مسلم حکومت مرد اور خواتین کے لیے علاحدہ علاحدہ انتظام کر سکتی ہے۔ذیل میں اس حوالے سے بعض اہم مفکرین کی آراء کا جائزہ پیش کیا جا رہا ہے:

شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن بازؒ نے ''فتاوی اسلامیۃ'' میں ''**حکم الاختلاط فی التعلیم**'' کے تحت صنعاء یونی ورسٹی کے پرنسپل عبدالعزیز مقالح کے ایک مضمون میں ان کی سخت گرفت کرتے ہوئے تنقید کی ہے، جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ طالبات کو طلبہ سے تعلیم کے میدان میں الگ کر دینے کا مطالبہ شریعت کے خلاف ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ عہد نبوی میں مرد اور عورت ایک ہی مسجد میں نماز ادا کرتے تھے۔شیخ عبدالعزیز نے مختلف دلائل کے ذریعے اسے رد کرنے کے بعد لکھا:

”پرنسپل کو یہ بات کس طرح سے زیب دیتی ہے کہ وہ اختلاط کی دعوت دیں اور یہ گمان کریں کہ اسلام نے بھی اس کی دعوت دی ہے اور یونی ورسٹی کا ماحول بھی مسجد ہی کی طرح ہے اور تعلیمی اوقات نماز کے اوقات ہی کی طرح ہیں...... کسی مومن کو یہ بات کیوں کر زیب دیتی ہے کہ وہ یہ کہے کہ ایک طالبہ کا طالب علم کے ساتھ تعلیمی نشست پر بیٹھنا بالکل اسی طرح ہے جس طرح ایک مسلمان عورت اپنی مسلم بہنوں کے ساتھ مل کر مردوں کی صفوں کے پیچھے مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں بیٹھتی ہے...... آج کی تعلیم اور عہد نبوی میں مردوں کے پیچھے عورتوں کے نماز ادا کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصلحین اس بات کی دعوت دے رہے ہیں کہ مردوں اور عورتوں کے تعلیمی ادارے الگ ہونے چاہئیں، تاکہ لڑکیاں حجاب اور مشقت کے بغیر سہولت اور راحت کے ساتھ اپنی استانیوں سے تعلیم حاصل کر سکیں، اس سے نوجوان بھی ان کے فتنے سے محفوظ رہیں گے اور تعلیم کی طرف اپنی توجہ مبذول کر سکیں گے۔“ [۱۲]

پروفیسر ثریا بتول نے کلی طور پر مخلوط تعلیمی نظام کو رد کر دیا ہے، نیز انہوں نے اس نظام کے قائل ماہرین تعلیم کے دلائل کا ناقدانہ جائزہ بھی لیا ہے۔ وہ اس حوالے سے اپنی کتاب میں لکھتی ہیں:

”مخلوط تعلیم ہمارے معاشرے کے لیے ایک لعنت ہے۔ نئی روشنی سے متاثر بڑے بڑے ماہرین تعلیم اس کے کتنے ہی فائدے گنوائیں مگر ”**واثمهما اكبر من نفعهما**“ کے مصداق اس کی ایک خرابی ہی پوری خوبیوں پر پانی پھیر دینے کے لیے کافی ہے اور وہ ہے عورت کی عصمت و عفت اور حیا کی ارزانی۔“ [۱۳]

ڈاکٹر احمد شلبی [۱۴] نے اپنی کتاب ”**تاريخ التربية الاسلامية**“ میں ”**تعليم المرأة**“ کے تحت سوال قائم کیا ہے کہ کیا ایک لڑکی بچوں اور نوجوان مردوں کے ساتھ تعلیم حاصل کر سکتی ہے یا نہیں؟ پھر خود ہی انہوں نے اس کا جواب دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس حوالے سے ڈاکٹر

محمد فواد الاہوانی اور ڈاکٹر خلیل طوطح کی مثبت رائے صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اول الذکر نے تو اپنی کتاب میں دوسری جگہ ہی اپنے دعویٰ سے رجوع کرلیا ہے اور ثانی الذکر نے جو دلیلیں دی ہیں وہ آزاد خاتون کی نہیں، بل کہ باندی سے متعلق ہیں اور باندی کے حکم کا اطلاق ایک آزاد عورت پر نہیں کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ باندی کو مخلوط مجلس میں جانے کی اجازت دی گئی ہے۔ نیز انہوں نے دلیل دی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ کو مردوں کے بجائے حضرت شفاء بنت عبداللہ العدویۃ سے تعلیم حاصل کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے متعدد دلائل پیش کیے ہیں۔ وہ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "The example of Al-Shaffa's teaching Hafsah privately was taken as a model for the teaching of girls. I have found no evidence to show that the girl joined the Kuttab or the women learnt with the men....Some writers fell into error on this point. Khalil Turah in his work Al-Tarbiyah wa Al-Talim Ind Al-Arab p.69 attributes three quotations to Al-Aghani to prove that the girl joined the Kuttab, with the boy, but these passages do not appear thus in source. Al-Ahwani, in considering this point, gives contradictory statements. At first he records that girls were taught in the Kuttab and further on he says:(It was the custom for girls to be educated at home.)"[۱۵]

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے جب مخلوط تعلیمی نظام سے متعلق سوال کیا گیا تو انہوں نے بنیادی

طور پر اسے رد کر دیا، البتہ بہ حالت مجبوری میں اسے چند شرائط کے ساتھ جائز قرار دیتے ہوئے فرمایا:

''ہم مخلوط تعلیمی نظام کو بالکل غلط قرار دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغربی اقوام آج جس اخلاقی پستی اور معاشرتی انتشار میں مبتلا ہیں اور وہاں خاندانی نظام جس تباہی کو پہنچا ہوا ہے، اس میں دوسری چیزوں کے علاوہ مخلوط تعلیمی نظام کا بھی حصہ ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ لڑکیوں کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دی جائے، لیکن ان کے لیے درس گاہوں کا الگ سے انتظام کیا جائے۔ جب تک یہ نہیں ہوتا اور لڑکیوں کو مخلوط میڈیکل کالجوں میں مجبوراً جانا پڑتا ہے، انہیں زیادہ سے زیادہ اسلامی حدود کا خیال رکھنا چاہیے۔ انہیں کالجوں میں بے پردہ نہیں جانا چاہیے اور کالجوں کے اندر بھی منہ اور ہاتھ کا وہی حصہ کھولا جائے جو حصول تعلیم کے لیے ناگزیر ہو۔ مزید برآں لڑکوں اور اساتذہ سے کسی قسم کا میل جول رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، میں اس سے زیادہ کوئی اور مشورہ نہیں دے سکتا۔''[۱۶]

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ایک سوال کے جواب میں غیر مخلوط تعلیمی نظام کو بہتر کہا ہے، البتہ انہوں نے مخلوط تعلیمی نظام کو بعض شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے اور اس کے لیے دلیل پیش کی ہے کہ مسجد نبوی میں مرد اور خواتین دونوں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفید ہوتے تھے، ممکن ہو کہ ان کی نشستیں الگ الگ ہوں، چنانچہ اگر کالج اور یونی ورسٹی میں مردوں اور عورتوں کے بیٹھنے کی جگہ الگ ہو تو اس طرح کی مخلوط تعلیم میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح انہوں نے قرآن کریم کی سورۃ احزاب کی آیت 53 سے استدلال کرتے ہوئے بتایا کہ پردے کے پیچھے سے عورت سے کچھ طلب کرنا یا معلوم کرنا جائز ہے۔[۱۷]

ڈاکٹر یوسف القرضاوی[۱۸] مغربی مخلوط تعلیمی نظام کو رد کرتے ہیں، البتہ اس کے مضر پہلوؤں سے اجتناب کرتے ہوئے شریعت کی بعض شرائط کے ساتھ اسے قبول کر لینے کی گنجائش فراہم کرتے ہیں۔ اس حوالے سے انہوں نے اپنی کتاب ''**فتاوی معاصرۃ**'' میں ''**اختلاط الجنسین**'' کے تحت طویل بحث کی ہے اور اس میں انہوں نے مختلف دلائل سے بتایا ہے کہ مسلمان اس حوالے سے

افراط وتفریط کا شکار ہیں نیز موجودہ دور میں عورت کو گھر میں قید رکھنے اور تمام تر اختلاط سے دور رکھنے کا تصور عہد نبوی میں نہیں تھا اور نہ ہی انہیں مغرب کی طرح مکمل آزادی دی گئی تھی، یعنی انہیں اخلاقی پابندیوں کے ساتھ گھروں سے باہر جانے کی پوری آزادی تھی۔اسی طرح انہیں درس وتدریس کی ان مجلسوں میں بھی شریک ہونے کی اجازت تھی جہاں مرد حضرات ہوا کرتے تھے۔وہ اس حوالے سے قرآن وسنت کی روشنی میں اختلاط کے شرعی حدود کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عورتوں اور مردوں کے درمیان اختلاط کوئی ناجائز اور گناہ کا کام نہیں ہے۔یہ نہ صرف جائز ہے، بل کہ بسا اوقات یہ اختلاط ضروری ہوجاتا ہے جب کوئی عظیم مقصد کا حصول ہو یا کسی بھلائی اور نیک کام کی انجام دہی میں دونوں کی مشترکہ جد وجہد اور باہمی تعاون کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو، جیسے علم نافع کا حصول اور لازمی جہاد کا موقع وغیرہ، البتہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس اختلاط کی وجہ سے ان دونوں کے درمیان کی حدوں کو ختم کر دیا جائے اور تمام شرعی قواعد وضوابط کو نظر انداز کر دیا جائے جیسا کہ مغربی معاشرے میں یا غیر مسلم ممالک میں ہوتا ہے۔''[19]

پس چہ باید کرد؟

مخلوط تعلیمی نظام ہندوستان کے تمام مسلمانوں کا مسئلہ ہے، جب کہ یہ ان کا اپنا نظام نہیں ہے، بل کہ مغربی تہذیب کا شاخسانہ ہے، کیوں کہ برصغیر میں انگریزوں نے اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے جو نظام تعلیم نافذ کیا تھا وہ مکمل طور سے مغربی تہذیب کا آئینہ تھا اور اس کا خاص مقصد مسلمانوں کی نئی نسل کو مغربی تہذیب وتمدن کا نمونہ بنانا تھا اور وہ اس میں بہت حد تک کامیاب بھی رہے۔بہرحال اس حوالے سے مسلمان تین بڑے حصوں میں تقسیم نظر آتے ہیں۔

(الف) ایک طبقہ وہ ہے جس نے مخلوط تعلیمی نظام کو جوں کا توں کھلے دل سے قبول کرلیا ہے اور اب اسے پرواہ نہیں ہے کہ ان کی اولاد مسلمان رہتی ہیں یا نہیں؟ یا ہندو، عیسائی یا یہودی بن جاتی ہیں، نیز ان کے اخلاق وعادات اسلامی تعلیمات کے مطابق ہیں یا نہیں؟ اسے صرف اس بات سے

مطلب ہے کہ ان کی اولاد پڑھ لکھ کر زیادہ سے زیادہ مال و دولت کمانے کے لائق ہو جائے، بس کافی ہے۔

(ب) دوسرا طبقہ وہ ہے جس نے مخلوط تعلیمی نظام کو سرے سے رد کر دیا ہے اور وہ اپنی اولادوں کو مدارس وغیرہ میں تعلیم دلانے پر اکتفاء کرتا ہے یا بہت ہوا تو انہیں پرائیویٹ سے عصری تعلیم دلا کر زمانے کے ساتھ چلنے کا لائق بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مخلوط تعلیم کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔

(ج) تیسرا طبقہ وہ ہے جو مخلوط تعلیمی نظام کے مضر اثرات سے واقف تو ہے، لیکن وقت اور حالات کے پیش نظر بہ حالت مجبوری اور بادل ناخواستہ اپنی اولادوں کو مخلوط تعلیم دلانے پر آمادہ ہے، نیز وہ اپنے بچوں اور ان کے دوستوں کی مصروفیات پر کڑی نگاہ رکھتا ہے تا کہ حتی الامکان انہیں غلط راہ اور صحبت اختیار کرنے، الحادیت، آوارگی اور دوسرے مسائل سے محفوظ رکھا جائے۔ اس میں وہ کبھی کام یاب ہوتا ہے اور کبھی اسے ناکامی کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کس طبقہ کو صحیح کہا جائے اور ان حالات میں کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے؟ اس سلسلے میں راقم کی رائے یہ ہے کہ والدین اپنی اولادوں بالخصوص بچیوں کو ہر حال میں تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں، تا کہ وہ ملک و ملت کی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکیں، خواہ وہ مدرسوں میں پڑھیں یا اسکول، کالج اور یونیورسٹی یا اوپن یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کریں، نیز لڑکیاں ایسے شعبوں میں تعلیم حاصل کریں جو ان کے لیے جسمانی اور دماغی اعتبار سے موزوں ہوں، جیسے درس و تدریس، طب، صحافت، تصنیف و تالیف اور صنعت و حرفت وغیرہ۔ اسلام نے خواتین کو ان تمام میدانوں سے استفادہ کرنے کی اجازت دی ہے، حتیٰ کہ ان میدانوں میں بعض پابندیوں کے ساتھ انہیں ملازمت کرنے کی بھی اجازت دی ہے اور یہ پابندیاں اس لیے لگائی گئیں ہیں کہ خاندانی نظام میں کوئی خلل و انتشار پیدا نہ ہو اور وہ عفت و عصمت کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ مخلوط تعلیمی نظام کی خرابیوں اور اس کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے تمام والدین کی ذمے داری ہے کہ وہ گھروں میں اپنی اولادوں کو (خواہ وہ مدارس میں پڑھیں یا مخلوط تعلیمی نظام کے تحت) ابتدائی پانچ سال اسلامی نکتۂ نظر سے یکساں تعلیم دیں اور ان کے دل و دماغ میں عقیدۂ توحید، رسالت، آخرت اور قرآن وسنت

کی اہمیت نقش کر دیں، نیز انہیں حقوق اللہ، حقوق العباد، نیکی اور بدی میں فرق، سچائی، صفائی، وقت کی پابندی، محبت اور ایثار کا سبق دیا جائے کہ وہ جہاں بھی رہیں، اپنی زندگی صاف ستھری اور پاکیزہ اسلامی طریقے سے بسر کرسکیں۔مزید برآں جب بچے اور بچیاں پانچ سال سے زائد کی ہو جائیں تو ان کی تعلیم میں عربی زبان ضرور رکھی جائے تاکہ وہ قرآن وحدیث پڑھ اور سمجھ سکیں اور ان کے عقائد، اخلاق اور حیاو کردار میں پختگی آئے کہ بعد میں وہ جب کالجوں اور یونیورسٹیوں میں قدم رکھیں تو بجائے خود متاثر ہونے کے دوسروں کو متاثر کرسکیں۔بدقسمتی سے ہمارے یہاں قرآن اور حدیث پڑھنے پر تو زور دیا جاتا ہے لیکن سمجھنے پر نہیں۔

آخری بات یہ ہے کہ مختلف مسلم دانش وروں اور علماء کرام نے ہمیشہ مخلوط تعلیمی نظام کی مخالفت کی ہے، لیکن آپ جب کسی چیز کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اس کا متبادل تیار کرنا ضروری ہے۔صرف مخالفت کرنے یا اس پر پابندی لگانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔اگر مروجہ تعلیمی نظام میں جانے سے طلبہ وطالبات کو روک دیا جائے تو ظاہر ہے کہ پھر وہ تعلیم سے دور ہو جائیں گے۔اس لیے ضرورت اس بات کی بھی ہے کہ الگ الگ تعلیمی ادارے کھولے جائیں اور یہ کوئی ناممکن کام نہیں ہے، جہاں تک اس کام کے لیے روپئے اور وسائل کی بات ہے تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے مسلمانوں کے پاس دونوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔روز بروز نئی نئی مختلف مسلم تنظیموں اور سیاسی پارٹیوں کا وجود میں آنا اس بات کی قوی دلیل ہے، بس جنون، لگن، صحیح رہنمائی اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔جنوبی ہندوستان میں اس طرح کے متعدد ادارے کھولے گئے ہیں، لیکن وہ تعداد میں بہت کم ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہیں، چنانچہ اس سلسلے میں مزید محنت کرنے کی ضرورت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ العلق:05-01

۲۔ السنن، ابی عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی، دار الرسالة العالمية، الطبعة الاولیٰ، 2009، أبواب السنة، باب: فضل العلماء و الحث علی طلب العلم، الجزء الاول، رقم الحدیث: 224، ص 151

۳۔ ملاحظہ ہو: سچر کمیٹی رپورٹ، اردو ترجمہ، فرحت احساس (ہندوستان کے مسلمانوں کی سماجی، اقتصادی اور تعلیمی حالت)، حکومت ہند، سردار پٹیل بھون، پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی، 2006، صفحات 68-48

۴۔ The Encyclopedia Britannica, New York: Encyclopedia Britannica, Inc., 342 Madison Avenue, Eleventh Edition, 1910-1911, Volume VI, P.637

۵۔ ملاحظہ ہو: Plato Republic, Translated by C.D.C. Reeve, Cambridge: Hackett Publishing Company, Inc.

۶۔ مارٹن لوتھر (1546-1483) مشہور جرمن پادری، ماہر الٰہیات، مصنف اور ایک ایسے پروٹسٹنٹ فرقہ کے بانی تھے، جو جدید رجحانات کا حامل ہے۔ انہوں نے ہی مسیحیت میں متعدد اصلاحات کیں اور اپنے حاملین کو پاپائے روم کے مختلف مظالم اور بے جا رسم ورواج سے آزادی دلائی تھی۔ اسی طرح انہوں نے دوران قید بائبل کا پہلی مرتبہ جرمن زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

۷۔ یوہان پیتالوزی (1827-1746) کا تعلق سوئزرلینڈ سے تھا۔ یہ پہلے ایسے ماہر تعلیم اور دانش ور تھے جنہوں نے صنعتی دور کے تعلیمی مسائل کا مطالعہ کیا تھا اور ایک بہتر عام تعلیم پر زور دیا تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ کم تر سے کم تر انسان میں تعلیم حاصل کرنے اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو جلا بخشنے کا مادہ پایا جاتا ہے، اس لیے سب کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے، نیز انہوں نے ذہنی، جسمانی، اخلاقی تربیت پر بھی خصوصی زور دیا تھا۔ ان کے تعلیمی نظریات بہت مقبول ہوئے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ متعدد ماہران تعلیم جیسے فرویل، ہربارٹ اور کارل رٹر وغیرہ نے ان کے نظریات سے نہ صرف استفادہ کیا ہے، بل کہ انہیں اپنے یہاں جگہ بھی دی ہے۔

۸۔ The Encyclopedia Britannica, Volume VI, P.P. 637-640

۹۔ صحیح بخاری، أبی عبداللہ محمد بن اسمٰعیل البخاری، المطبعة السلفية ومكتبتها، 1400 ہجری، کتاب العلم، باب: هل يجعل للنساء يوم على حدة فى العلم، الجزء الاول، رقم الحدیث: 101، ص53

۱۰۔ صحیح مسلم، أبی الحسین مسلم بن حجاج النیسابوری، بيت الأفكار الدولية للنشر و التوزيع، الرياض، 1998، کتاب صلاة العيدين، باب: ذكر اباحة خروج النساء فى العيدين الى المصلى، رقم الحدیث: 890، صفحات 343-342

۱۱۔ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز (1999-1912) کا تعلق ریاض، سعودی عربیہ سے تھا۔ وہ مفتی اعظم، سعودی عربیہ تھے۔ انہوں نے اپنی متعدد کتابوں اور فتاویٰ سے امت مسلمہ کی کما حقہ رہ نمائی کی تھی، چنانچہ محمد بن عبدالعزیز نے ان کے متعدد فتاوی کو "فتاوى اسلامية" میں جمع کر دیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ افراد مستفید ہوسکیں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ محمد خالد سیف، پاکستان نے کیا ہے اور انہوں نے بالعموم بامحاورہ ترجمہ کیا ہے، نیز مختلف جگہوں پر عبارتیں چھوٹ بھی گئی ہیں، اس لیے راقم نے اصل ماخذ سے استفادہ کیا ہے۔

۱۲۔ ملاحظہ ہو: فتاویٰ اسلامية لأصحاب الفضيلة العلماء: سماحة الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز، فضیلة الشیخ محمد بن صالح بن عثیمین، فضیلة الشیخ عبداللہ بن عبدالرحمٰن الجبرین، جمع وترتیب: محمد بن عبدالعزیز المسند، دار الوطن للنشر، الرياض، الطبعة الثانية، 1413ھ، الجزء الثالث، صفحات 98-94

۱۳۔ ملاحظہ ہو: اسلام میں عورت کا مقام و مرتبہ، علوی، ثریا بتول، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، بار سوم، سن

اشاعت غیر مذکورہ، صفحات153-154

۱۴۔ موصوف کا تعلق مصر کے ایک معروف علمی خانوادے سے ہے۔ان کی دل چسپی کے موضوعات تاریخ وتمدن، مذاہب، اور اسلامی ثقافت وغیرہ ہیں۔انہوں نے ان موضوعات پر انگریزی، عربی اور انڈونیشیائی زبانوں میں تیئس سے زائد کتابیں قلم بند کی ہیں۔ان کی معروف کتابوں میں سے ایک "History of Muslim Education" ہے، جو درحقیقت ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے اور اسے انہوں نے مشہور مستشرق پروفیسر اے جے آربری (A.J.Arberry) کی نگرانی میں کیمبرج یونی ورسٹی سے مکمل کیا تھا۔اس کتاب کا عربی ترجمہ ''تاریخ التربیة الاسلامیة'' کے نام سے اور اردو ترجمہ ''تاریخ تعلیم وتربیت اسلامیہ'' کے عنوان سے منظر عام پر آچکا ہے۔راقم نے دوران مطالعہ موضوع کے حوالے سے عربی ترجمہ میں کافی فرق پایا، اس لیے دونوں عبارتوں کا تذکرہ کیا ہے۔عربی کتاب کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ التربیة الاسلامیة، شلبی، احمد، دارالکشاف للنشر و الطباعة والتوزیع، بیروت، 1954، صفحات321-324

۱۵۔ History of Muslim Education, Ahmad Shalaby, Karachi: Indus Publications, 1979, P.P 100-101

۱۶۔ استفسارات، مودودی، سید ابوالاعلیٰ، مرتب: اختر حجازی، ادارہ ترجمان القرآن، پرائیویٹ لمیٹڈ (لاہور) طبع دوم، 1992، حصہ اول، ص156، نیز بار اول1994، ص۲۸۰، نیز ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن، مودودی، سید ابوالاعلیٰ، مکتبہ تعمیر انسانیت (لاہور) طبع نہم، 1972 جلد چہارم، الاحزاب:53، حاشیہ:98، ص121

۱۷۔ ملاحظہ ہو: خطبات بہاولپور، محمد حمید اللہ، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد (پاکستان) اشاعت اگیارہ، 2007، صفحات283-284

۱۸۔ پروفیسر ڈاکٹر یوسف القرضاوی (پ1926) کا تعلق مصر سے ہے اور موصوف کا شمار دور جدید کے صاحب بصیرت اور مایہ ناز محقق میں ہوتا ہے۔ان کی مختلف موضوعات پر چالیس سے زائد کتابیں موجود ہیں، نیز ان کے خطبات، دروس اور فتاویٰ سے بھی امت مسلمہ نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ان کی ایک کتاب ''فتاویٰ معاصرة'' ہے جو مختلف فتاوی پر مشتمل ہے۔اس کا اردو ترجمہ ''فتاوی یوسف القرضاوی'' کے نام سے ہو چکا ہے، البتہ دوران مطالعہ معلوم ہوا کہ اس میں مترجم سید زاہد اصغر فلاحی نے بنا کسی وضاحت کے متعدد کلمات کا اضافہ اپنی جانب سے کر دیا ہے، جو اصل عبارت میں نہیں ہیں۔اس لیے راقم نے اصل کتاب سے استفادہ کیا ہے اور اسی کا حوالہ دیا ہے۔

۱۹۔ القرضاوی، یوسف، فتاویٰ معاصرة، دارالقلم، کویت، 1992، الجزء الثانی، صفحات 284-286

دین اور اس کی ضرورت

عتیق الرحمٰن قاسمی

■■■

عتیق الرحمٰن قاسمی*

دین اور اس کی ضرورت

دین عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی معاملہ کرنا ہے۔عربی میں ایک مقولہ ہے "دُنَّاهُمْ کمادانوا" ہم نے ان کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا جیسا کہ انہوں نے کیا تھا،قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔'ان الدین عند اللہ الاسلام'.(بے شک اللہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے)۔

دین اسلام کی یا شریعت کی زبان میں اس نظامِ زندگی کو کہتے ہیں جس میں مرکزِ اطاعت خدا کی ذات ہو،یعنی ایک انسان اس دنیا میں جو کچھ کرے وہ خود اپنے ساتھ کرے یا کسی اپنے پرائے کے ساتھ وہ سب خدا کے حکم کے ماتحت ہونا چاہیے۔حقیقت یہ ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے یعنی جانوروں اور چوپایوں کی طرح الگ تھلگ زندگی بسر نہیں کرتا اور نہ ہی کرسکتا ہے، بلکہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے پر فطرتاً مجبور ہے۔اس بناء پر سینکڑوں ہزاروں قسم کے معاملات ہیں جو اسے پیش آتے ہیں ،اور وہ ان کے متعلق کسی ایک قطعی حکم کا خواہاں ہوتا ہے۔انسانی معاشرہ کو فساد اور تباہی و بربادی سے بچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس طرح کے معاملات میں ایک فرد کے لیے یا ایک جماعت اور گروہ کے لیے کوئی حکم ایسا ہونا چاہیے جس سے انسان کے جائز حقوق کی پامالی نہ ہو اور جس میں اس کے مفاد کو کسی دوسرے انسان کے مفاد پر قربان نہ کر دیا گیا ہو۔

* ریسرچ اسکالر،شعبۂ دینیات (سنی) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ کرتے وقت فطرتاً ذاتی، خاندانی یا قبائلی منفعت ومفاد کومقدم رکھتا ہے، اسی لیے ہر گاہک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس چیز کا وہ سودا کر رہا ہے وہ اس کوکم سے کم قیمت پر مل جائے۔ اس وقت اس کے دماغ میں پھر یہ خیال بالکل نہیں ہوتا کہ بیچنے کو اس صورت میں نفع ہوگا یا نقصان؟ اسی کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ انسان فطرتاً مفاد پرست ہوتا ہے۔ اسے اپنی منفعت کے پیچھے دوسرے کے نقصان کا مطلق خیال اور اپنی لذت کوشی کی خاطر دوسرے کی اذیت کا ذرا دھیان نہیں رہتا۔ انسان بسااوقات ایسی مذموم حرکت کر بیٹھتا ہے، جو اسے مرتبۂ انسانیت سے گرا دیتی ہے۔

حقیقت یہی ہے کہ ہر معاملہ اور ہر برتاؤ میں اچھے برے دونوں پہلو ہوتے ہیں، مثلاً آپ کے پاس کوئی سائل آیا ہے وہ آپ سے کسی مالی امداد کا خواہاں ہے۔ آپ اس وقت اچانک کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ سائل کے سوال کو پورا کر دینا چاہیے یا نہیں بلکہ تھوڑی دیر کے لیے سوچنے لگتے ہیں کہ اگر اس سائل کا سوال پورا کر دیا گیا تو آپ کے پاس روپیہ پیسہ کم ہو جائے گا، پھر اس سائل کو دیکھ کر دوسرا سائل آئے گا۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح دراز رہا تو اپنی ساری دولت دے چکنے پر بھی اربابِ احتیاج کی حاجت وضرورت پوری نہیں کر سکتا۔

مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر انسانی معاشرہ میں نظم وضبط قائم رکھنے اور ایک انسان کو دوسرے انسان پر بلکہ زیادہ سچ یہ ہے کہ خود اپنے اوپر ظلم کرنے سے باز رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسانی معاشرہ ایک قانون یا دستور کا پابند ہو۔ پہلے زمانے میں شخصی حکومتیں ہوتی تھیں اور پوری مملکت میں امن وامان کے قیام کا دارومدار ایک شخص کے اشارۂ جنبش پر ہوتا تھا۔ آج کل دستوری وآئینی حکومت کا زمانہ ہے۔ عوام کے نمائندے خود ایک آئین ودستور بناتے ہیں اور پھر اپنی ایک نمائندہ حکومت قائم کر کے اس آئین کی تنفید کا اختیار اس حکومت کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔

اس سے یہ ظاہر ہے کہ انسانی معاشرہ میں امن وامان اور سکون واطمینان کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس معاشرے کے تمام افراد کا ایک مرکزِ اطاعت ہو، پھر یہ مرکز کوئی ایک شخص ہو کہ اس کے ہاتھ میں قانون نافذ کرنے کی طاقت ہو۔ ان کے معاشرہ کے اطمینان وسکون اور اس کی عافیت وخوش حالی کا انحصار اس ایک قانون یا دستور یا اس معاہدہ پر ہے جس کو سب نے مان لیا ہو اور جس کی پابندی کا سب

نے عہد کیا ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ واقعی ایک دستور وآئین اور معاہدہ کی رسمی پابندی کا اعلان انسانی معاشرہ کو حقیقی امن وعافیت کی وہ نعمت وراحت بخش دیتا ہے جس کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا تھا۔

آج مجلسِ اقوام متحدہ کے ماتحت پوری دنیا ایک مشترکہ دستور کے رشتہ سے بندھی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود پوری انسانی آبادی معلوم ہوتا ہے کہ آتش فشاں پہاڑ پر بیٹھی ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ کب یہ پہاڑ پھٹ پڑے گا اور آدم وحوا کے بیٹوں اور بیٹیوں کو ہلاک وبربادی کے کس گڑھے میں گرادے گا؟ اربابِ جاہ وثروت عشرت وراحت کی خود فراموشیوں میں اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کرۂ ارضی کے اوپر بسنے والے ایک ایک انسان کا دل چیر کر دیکھو اس کی تہہ میں غم واضطراب اور تشویش وفکر مندی کی دبی ہوئی لہریں ملیں گی۔ آج کا دن اگر خیریت سے گزر گیا تو نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا؟ لیکن وہ اب فتوحات پر نازاں نہیں بلکہ خود پشیمان ہے کیوں کہ جن چیزوں کو اس کی عظمت ونعمت کا سب سے بڑا نشان ہونا چاہیے تھا وہی اب اس کی زندگی، اس کی حیاتِ قومی، اس کی تہذیب وتمدن اور اس کے ملک کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن گئی ہیں اور ان چیزوں کی ایجاد واختراع میں اب اس کا قدم ایک ایسی منزل میں پہونچ گیا ہے کہ وہ پیچھے بھی نہیں لوٹ سکتا، پھر یہ بھی دیکھو کہ ان سب قوموں نے جس معاہدے پر دستخط کیے ہیں وہ انسانی حقوق کے جس چارٹر کی متفقہ طور پر حمایت کرتا ہے اس کی دفعات کیا ہیں؟ یہی کہ سب انسان برابر ہیں، کسی ایک قوم کو دوسری قوم پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، کسی ایک انسانی گروہ کو اس کی آزادی نہیں ہوگی کہ وہ اپنی طاقت وقوت کا ناجائز استعمال کر کے دوسرے گروہ کے کلچر، تہذیب وتمدن اور اس کی قومی روایات کو پامال کرے، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اس ناکامی ونامرادی کا ایک ہی خاص سبب ہے اور وہ یہ کہ ان تمام معاہدہ کرنے والوں نے کسی اپنے سے اور سب سے بالاتر ہستی کے سامنے اپنے عہد وپیمان پر قائم رہنے اور اپنے قول میں صادق اور ثابت قدم رہنے کا عہد نہیں کیا ہے۔ یہ سب معاہدے ایک قوم کے دوسری قوم کیساتھ یا دنیا کی سب قوموں کے آپس میں متفقہ معاہدے ہیں، جو کسی ڈر یا خوف یا کسی منفعت ومفاد جو اس معاہدے کے لیے اصل بنیاد کا حکم رکھتا تھا کسی ایک خاص قوم کے حق میں مضمحل ہو جاتا ہے، تو اس معاہدے کے شرائط ودفعات کی پابندی میں بھی خود بخود اضمحلال

پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ زبان سے جمہوریت اور مساوات کا نعرہ لگا رہے ہیں، ان کے ہاتھوں کو دیکھو تو خون سے رنگین نظر آئیں گے، جو امن و امان اور صلح و آشتی کے لیے آج سب سے زیادہ بیقرار اور اس کے سب سے بڑے علمبردار ہیں، ان کے اعمال کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جنگ کی آگ بھڑکا دینا ان کے دل کی سب سے بڑی تمنا ہے۔

بہرحال عصبیت ایک چیز ہے جو بنی نوعِ انسانی کی وحدت میں رخنہ پیدا کرتی ہے، اور جو ایک ہی نوع کے افراد کو مختلف ٹولیوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ یہ بت جن کو ان قوموں نے اپنا امیرِ اطاعت قرار دیا ہے خود انہیں کے ہاتھوں تراشیدہ اور انہیں کے ذہن و فکر کے آفریدہ ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ ان کو اپنے کسی عمل پر نہ احتساب کا اندیشہ ہے اور نہ کسی فعل پر باز پرس کا خوف، مفاد پرستی ان کے عمل کا سب سے بڑا محرک، سب سے بڑا ضابطۂ زندگی اور سب سے زیادہ مؤثر آئینِ حیات ہے، اس لیے وہ اعلیٰ کیرکٹر اور وہ بلند کردار جو کسی اعلیٰ ترین قدرِ حیات کے ساتھ وابستہ ہونے سے ہی پیدا ہو سکتا ہے اس کی توقع ان سے کسی طرح نہیں کی جا سکتی ہے۔ ایک شخص جو خدا پر ایمان نہیں رکھتا ممکن ہے اخلاقِ حسنہ اور اعمالِ صالحہ کا حامل ہو، لیکن اس کے یہ اوصاف اور یہ اخلاق اس کی اپنی ایک خاص طبیعت یا تربیت کا نتیجہ ہوں گے؟ اور ان کی بنیاد جذباتیت پر قائم ہوگی؟ اس کے برعکس جس شخص نے اپنے تمام جذبات و خواہشات کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیا ہے، اس کے عمل کا محرک بہ نسبت پہلے شخص کے زیادہ قوی اور مؤثر ہوگا، اور یہ تو قاعدہ کلیہ ہے کہ محرک جس درجہ اور جس قوت کا ہوگا حرکت بھی اسی درجہ اور اسی قوت کی ہوگی۔

حضرت عمرؓ کی نسبت اپنے اور پرائے سب کو تسلیم ہے کہ ان کو اہل ملک کی خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم خبر گیری کا کس قدر غیر معمولی اہتمام ہوتا تھا؟ بیرون مدینہ کے حالات وہاں سے آنے والے لوگوں میں سے ایک ایک سے کرید کرید کر پوچھتے تھے اور مدینہ کی گلیوں اور کوچوں کا گشت خود شب میں کرتے تھے۔ چنانچہ اسی طرح کے ایک موقع پر آپؓ کو کسی بچہ کی رونے کی آواز آئی۔ تو ماں سے جا کر کہا کہ بچے کو بہلائے کچھ دیر کے بعد پھر ادھر سے گزر ہوا تو دیکھا کہ بچہ اب بھی رو رہا ہے۔ آپؓ اس بچہ کی ماں پر خفاء ہوئے اور کہا تو بڑی بے رحم ہے۔ اب اس ماں نے کہا تم مجھے ڈانتے ہو اصل بات جو ہے اس کی تمہیں خبر ہی نہیں ہے۔ عمرؓ نے حکم دیا ہے کہ جب تک بچے کا دودھ نہ چھوٹے اس کو بیت المال سے وظیفہ نہ دیا جائے اس لیے میں زبردستی اس بچہ کا دودھ چھڑا رہی ہوں۔ جب حضرت عمرؓ نے اس عورت

کا یہ جواب سنا تو آپ بے حد متأثر ہوئے اور فرمایا کم بخت عمرؓ تو نے نہ جانے کتنے بچوں کا خون کیا ہوگا؟ اور اس کے بعد فوراً اعلان کرادیا کہ جس دن بچہ پیدا ہو اس کا وظیفہ اسی دن سے مقرر کیا جائے۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ شام کے سفر سے واپس ہو رہے تھے کہ کسی مقام پر ایک خیمہ نظر آیا، جب آپ قریب پہونچے تو وہاں ایک عورت پر نظر پڑی۔ آپؓ نے اس عورت سے معلوم کیا کہ تم کو کچھ عمر کا حال معلوم ہے؟ عورت نے کہا ہاں وہ شام سے واپس ہو رہا ہے، مگر مجھ کو تو اس سے ایک حبہ بھی نہیں ملا ہے۔ آپ نے اس عورت سے کہا تم شام میں رہتی ہو اور وہ مدینہ میں۔ عمر کو اتنی دور کا حال کیوں کر معلوم ہو سکتا ہے؟ اس پر عورت نے جواب دیا، اگر حال معلوم نہیں کر سکتا تو حکومت کیوں کرتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو بے ساختہ رو پڑے۔

عدل وانصاف اور مساوات و برابری کے الفاظ آج ہر شخص کی زبان پر ہیں۔ لیکن کیا تاریخ ِعالم میں کوئی ایک واقعہ بھی اس کی نظیر میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ فتح بیت المقدس کے موقع پر حضرت عمر فاروقؓ شہر میں داخل ہوتے ہیں تو اس طرح کہ آپ کا غلام اونٹ پر بیٹھا ہوا ہے اور آپ خود اونٹ کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ اونٹ ایک ہی تھا، آقا اور غلام دونوں باری باری سوار ہوتے چلے آرہے تھے۔ اتفاق سے بیت المقدس میں جب داخلہ کا وقت آیا تو وہ آپ کے غلام کی باری کا وقت تھا۔

صحابۂ کرامؓ کی زندگیوں میں اسطرح کے واقعات استثنائی حکم نہیں رکھتے بلکہ تاریخ وسیر کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو سینکڑوں ہزاروں واقعات ملیں گے جن کو پڑھ کر آج کل کی دنیا میں ان کو باور کرنا بھی مشکل ہوگا۔ صحابۂ کرامؓ تو خیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست فیضِ تعلیم وتربیت اٹھائے ہوئے تھے۔

اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں واقعات جو تاریخ کے اوراق میں بکھرے پڑے ہیں ان میں غور وفکر کرو اور دیکھو کہ ان کے اسباب کیا ہیں؟ یہ غیر معمولی جوشِ عمل، یہ حسرت انگیز اخلاص و بے نفسی حکومت کے اقتدارِ اعلیٰ کے باوجود یہ عاجزی وفروتنی، عقیدہ کی یہ پختگی اور کردار کی یہ بلندی یہ سب اوصاف کیا اس وقت پیدا ہو سکتے ہیں جبکہ انسان کے معتقدات اور اس کے اعمال وافعال کا تعلق براہِ راست ایک اعلیٰ ترین قدرِ حیات کے ساتھ نہ ہو؟

یہی وہ یقین تھا جس کے باعث حضرت عمرؓ باوجود اپنے تمام کمالات اوراعمالِ حسنہ کے بعض اوقات فرماتے تھے کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں عمرؓ کی جان ہے، میں توصرف اسی قدر چاہتا ہوں کہ قیامت کے دن بے مؤاخذہ چھوڑ دیا جاؤں۔

علاوہ ازیں اب ایک اور پہلو سے غور کرنا چاہیے اوروہ یہ ہے کہ ہرانسان کی فطرت اورطبیعت میں محبت کرنے کا جذبہ ہوتا ہے اوراس بناء پراس کو ایک ایسی ہستی کی ضرورت ہوتی ہے، جس کو وہ اپنی امیدوں ارمانوں اورتمناؤں کا مرکز بنائے ، اس کی یاد میں اسے لطف وسرور حاصل ہوتا ہو، اوراس کے غمِ عشق کی لذت وحلاوت کے مقابلہ آسائش راحت وعشرت ہردوجہانی ہیچ نظرآتے ہوں۔ایک طرف انسان کی یہ فطرت کہ وہ محبوب تلاش کرتا ہے ،اوردوسری جانب اس کی یہ محرومی اوربدنصیبی کہ وہ اس وسیع کارگاہ ہست وبود میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔غرض ہراس چیز سے جس کا اس سے دوریا نزدیک کا تعلق یا رشتہ ہوتا ہے، ہرایک سے محبت کرتا ہے اوردل لگاتا ہے، لیکن ہرانسان کی زندگی میں آخرایک وقت آتا ہے، جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اب تک اس نے جس چیز سے محبت کی تھی اس کی یہ محبت ناپائیدارتھی۔اس احساس کے بعدانسان میں تنہائی کا احساس شدید تر ہوجاتا ہے،اور وہ اپنے آپ کوسب کچھ رکھنے کے باوجوداکیلا ہی پاتا ہے۔لیکن جس شخص کے دل میں خدا کی محبت ہوتی ہے،اورمذہب سے لگاؤ ہوتا ہے، وہ کبھی کسی حالت میں اپنے تئیں تنہا محسوس نہیں کرتا ہے۔ ہرحالت میں خوش مطمئن اورمگن رہتا ہے اورکبھی اس کے اندر بددلی آزردگی اوردل گرفتگی کا احساس پیدانہیں ہوتا ہے۔اس پراگرغم کا پہاڑ ٹوٹتا بھی ہے تو یہ بدحواس اورسراسیمہ نہیں ہوتا ہے۔

موجودہ دورسائنس اورٹیکنالوجی کی ترقی کا دور ہے، بعض کوتاہ اندیش معلوم کرتے ہیں کہ اب بھلامذہب کی ضرورت کیا ہے ؟حقیقت یہ ہے کہ سائنس خواہ کتنی ہی ترقی کرے انسان بہرحال کبھی مذہب سے بے نیازنہیں ہوسکتا۔کیونکہ حقائقِ اشیاء کے متعلق ہمیشہ دواہم بنیادی سوال پیداہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ چیز کیا ہے،اوردوسرا یہ کہ یہ کیوں ہے؟ان میں سے پہلے سوال کا جواب سائنس کے دائرۂ اختیاروعمل میں ہے اوردوسرے کا جواب صرف اورصرف مذہب دے سکتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی تکمیل دونوں ہی سوالات کے جوابات پرمنحصر ہے۔اگرمذہب نے مدد نہ کی تو اندیشہ ہے کہ سائنس کی یہ حیرت انگیز ترقی ہی کہیں بنی نوعِ انسان کی عظیم اورناقابلِ تلافی ہلاکت وبربادی کی باعث نہ بن جائے۔

اسلام اور عصرِ جدید (سہ ماہی)

کے خاص شمارے

اسلامی تہذیب وتمدن (دورِ جاہلیت سے آغازِ اسلام تک) ۳۰۰روپے
نذرِ علی محمد خسرو...۱۰۰روپے
بیاد خواجہ غلام السیّدین...................................۱۰۰روپے
بیاد پروفیسر مشیر الحق....................................۲۰۰روپے
افکارِ ذاکر...۱۵۰روپے
مولانا عبیداللہ سندھی.......................................۲۰۰روپے
ڈاکٹر سید عابد حسین اور نئی روشنی......................۲۵۰روپے
مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت..................................۱۵۰روپے
نذرِ رومی..۲۰۰روپے
قرآن مجید، مستشرقین اور انگریزی تراجم...................۱۰۰روپے
پیکر دین ودانش: امام غزالیؒ.................................۳۰۰روپے
معلمِ عصر: سعید نورسیؒ ۲۰۰روپے

ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی ۱۰۰روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۲۵ فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطــہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

رسالہ جامعہ

کے خاص شمارے

جشن زریں نمبر	۱۰۰روپے
ڈاکٹر مختار احمد انصاری	۱۰۰روپے
سالنامہ ۱۹۶۱ء	۱۰۰روپے
اسلم جیراجپوری نمبر	۱۰۰روپے
پروفیسر محمد مجیب نمبر	۱۰۰روپے
مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں	۱۵۰روپے
پریم چند کی یاد میں	۱۰۰روپے
نہرو نمبر	۱۰۰روپے
جامعہ پلاٹینم جوبلی نمبر	۱۰۰روپے
ابوالکلام آزاد نمبر(پہلی اور دوسری جلد)	۳۰۰روپے
خواجہ حسن نظامی اور اُردو نثر	۱۰۰روپے
خلیل الرحمن اعظمی کی یاد میں	۱۰۰روپے
بلونت سنگھ کی یاد میں	۱۰۰روپے
ابوالفضل صدیقی کی یاد میں	۱۵۰روپے
نذرِ انیس	۳۰۰روپے
گاندھی اورگاندھیائی فکر	۳۰۰روپے

ان کے علاوہ پچھلے عام شمارے بھی (۱۹۶۱ء تا حال) فی ۱۰۰ روپے کی شرح سے دستیاب ہیں۔ اسٹاک محدود ہے۔ پانچ شماروں پر ۲۵ فیصد تجارتی کمیشن بھی دیا جائے گا۔ محصول رجسٹرڈ ڈاک خریدار کے ذمے ہوگا۔

رابطـــہ

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵